چہرے

مسعود مفتی

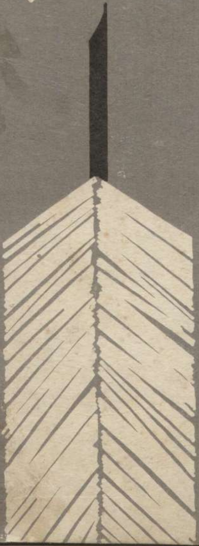

چہرے

(مشرقی پاکستان کے آخری لمحوں کی داستان)

مسعود مفتی

اِنتساب

مشرقی پاکِستان کے "بہاریوں" کے نام

پیش لفظ

۱۹۷۱ء کے دوران مغربی پاکستان کے قریباً تیس افسران مشرقی پاکستان میں تعینات ہوئے۔ جب جنگ میں حالات زیادہ خراب ہوئے تو آٹھ دسمبر کو ہم سب گورنر ہاؤس میں منتقل ہو گئے۔ پھر مشرقی پاکستان پر نزع کی ہچکیاں طاری ہوئیں تو گورنر ہاؤس بھی دارالامان نہ رہ سکا۔ چنانچہ چودہ دسمبر کو گورنر مشرقی پاکستان، اُن کے وزراء اور قریباً سبھی افسران کو ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں پناہ لینا پڑی۔ جو غیر جانبدار علاقہ تھا اور بین الاقوامی ریڈکراس کی تحویل میں تھا۔

انیس دسمبر کی صُبح کو ہم سب لوگوں کو ڈھاکہ چھاؤنی میں منتقل کر دیا گیا اور اس طرح ہم باضابطہ جنگی قیدی بن گئے۔

ہوٹل انٹرکانٹی نینٹل میں گزارے ہوئے پانچ دِنوں میں نہ صرف عظیم سیاسی تبدیلی دیکھنے میں آئی۔ بلکہ ہم لوگ ایک جان لیوا قلبی واردات اور لاتعداد ذہنی کرب سے گزرے۔ یہ رپورتاژ ان دِنوں کی زندگی کی ہلکی سی جھلک ہے۔

یہ ایک خالص ادبی تحریر ہے۔ اِسی لیے یہ مؤرخ کی تواریخ نہیں اخبار نویس کی سٹوری نہیں اور سیاستدان کا تجزیہ نہیں۔ ان حضرات کا مقصد یہ دیکھنا ہے کہ لوگوں کے ساتھ کیا ہُوا۔ مگر ادیب کی آنکھ یہ دیکھتی ہے کہ لوگوں کے دِلوں میں کیا ہُوا۔ اِن کے لیے واقعات بنیادی اور انسان ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ مگر ادیب کے لیے انسان

بنیادی اور واقعات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسی لیے کئی حالات ایسے ہیں جو مؤرخ یا جرنلسٹ کے لیے اہم مگر ادیب کے لیے غیر اہم ہیں۔ اور کئی واقعات پر مؤرخ یا جرنلسٹ کی نظر نہیں ٹھہرتی۔ مگر وہ ادیب کے ذہن میں زلزلے اُٹھا دیتے ہیں۔ چنانچہ اس تحریر کے لیے واقعات کا انتخاب ادیب کے نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔

یہ رپورتاژ کردار نگاری کے سانچے میں ڈھال گئی ہے مگر اس کے کردار بے نام اور مبہم ہیں۔ تاہم ان کا اندازِ گفتگو قائم ہے اگر مجھے ان باتوں سے اختلاف تھا تو بھی وہ اسی رنگ میں لکھی گئی ہیں جس رنگ میں کہی گئی تھیں۔ تاکہ کردار نگاری کے اصول مجروح نہ ہوں۔

آج ان واقعات پر اڑھائی سال کی گرد پڑ چکی ہے۔ اب حالات بدل گئے ہیں۔ سوچوں کے زاویے بدل گئے ہیں۔ اور ردِّ عمل کے انداز بدل گئے ہیں۔ اس لیے یہ یاد دہانی ضروری ہے کہ یہ تاثرات ان المناک لمحوں کے ہیں جب پاکستان کے دو ٹکڑے ہو رہے تھے۔ ویسے بھی رپورتاژ کی تکنیک کا تقاضا یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص وقت کے احوال کی معروضی باتیں اور اقدار کا احساس کرے اور ان لمحات کے بھرپور تاثر کو اس طرح گرفت میں لائے کہ اس پر مستقبل کے سایے نہ پڑیں۔ اگر ان لمحات کے فوراً بعد کیمرے کا شٹر بند نہ کیا جائے تو تصویر خراب ہو جائے گی۔ اور رپورتاژ فنی طور پر خام رہ جائے گی۔

مسعود مفتی

راولپنڈی ۱۷ جولائی ۷۴ء

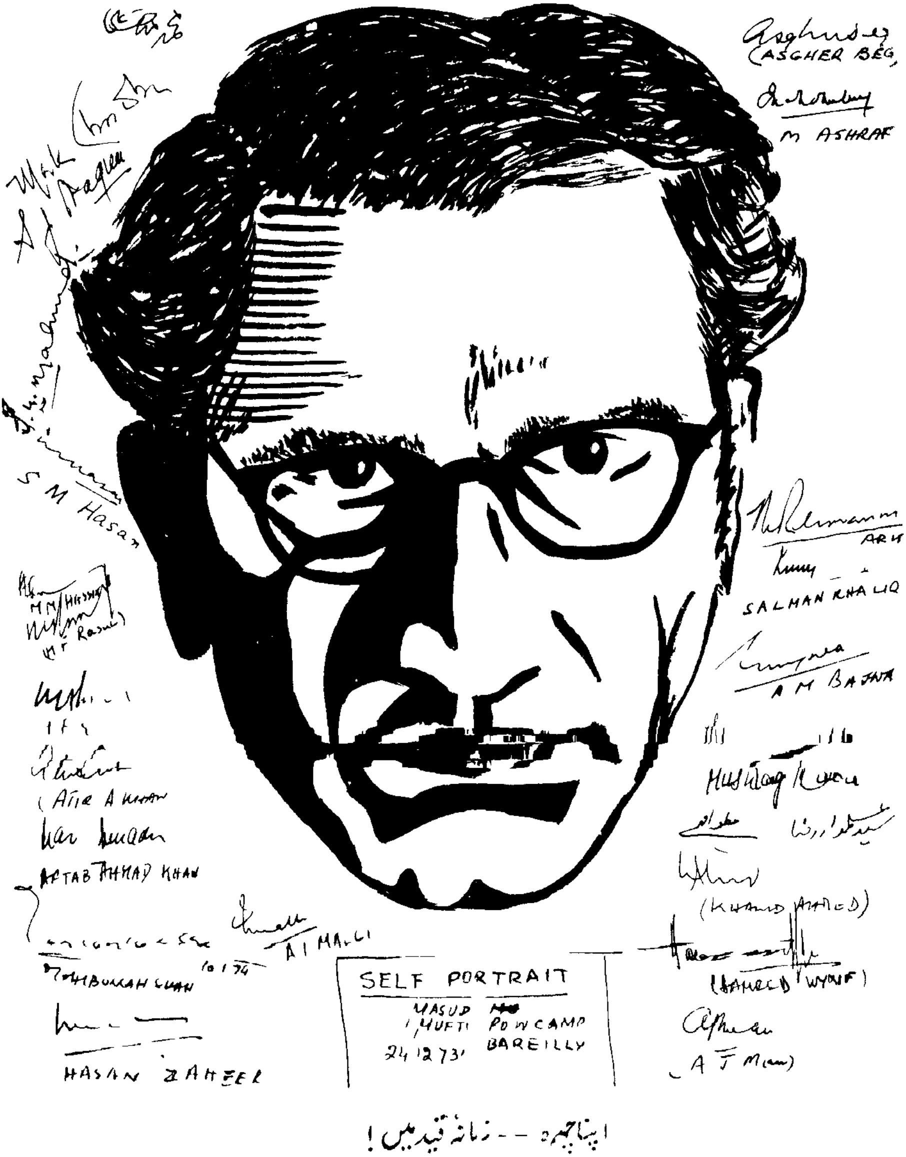

اپنا چہرہ -- زمانۂ قید میں!

آج پندرہ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے اور ڈھاکہ کی جنگ زوروں
پر ہے
مگر کیسی جنگ؟ نہ تیر و تفنگ، نہ شمشیر و سناں، نہ توپ
نہ ٹینک۔......
انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل کی سب سے اوپر والی منزل کے کمرہ
نمبر ۱۱۰۸ کی کھڑکی سے میں جھانکتا ہوں۔ تو ڈھاکہ شہر کی سڑکیں

بلند و بالا عمارتیں اور سبز گوشے سنسان پڑے ہیں۔ سامنے رمنا پارک گویا کلورو فارم سونگھے اپریشن ٹیبل پر بے حس و حرکت پڑا ہے۔ اس سے پرے ڈھاکہ امپرومنٹ ٹرسٹ کی بلڈنگ کا گھڑی بردار مینار مریض کی سکتہ زدہ ماں کی طرح ویران آنکھوں سے گھڑیاں گن رہا ہے۔ ایک طرف یونیورسٹی کی کئی منزلہ عمارتیں اپنی بلند و بالا ذات میں گم ہیں۔ ان سے پرے عظیم پُور گورنمنٹ کوارٹرز کی پانی کی ٹینکی تقدیر کی آنکھ بن کر جھانک رہی ہے۔ میری کھڑکی کے تقریباً نیچے ریڈیو پاکستان گورستان کی طرح خاموش ہے۔ ذرا آگے سابقہ شاہ باغ ہوٹل کی عمارت اپنے ماتھے پر ریڈکراس چپکائے دُعا میں ڈوبی ہوئی راہبہ کی طرح پُرسکون ہے۔ اور ویران چوراہے پر سکوت کا سایہ ڈال رہی ہے۔......... ہر چیز گُم سُم، پُرسکوت، اور دم سادھے ہوئے......

یہ کیسی جنگ ہے؟...... جو بیرونی ممالک کے ریڈیو کے مطابق آج پوُرے زوروں پر ہے

مگر پھر جنگ کا طبل بجتا ہے۔ ڈھاکہ کے ہر کونے سے ہوائی حملے والے سائرن پکار پکار کر خبردار کرنے لگتے ہیں۔ چند ہی منٹ بعد دو ہندوستانی ہوائی جہاز مشرق سے جھپٹ کر

آتے ہیں اور دو مغرب سے ۔ اور میری کھڑکی کے سامنے سے گرجتے ہوئے غوطہ لگاتے ہیں ۔ ان کے پیٹ کے نیچے شعلے پلک جھپکتے ہیں ۔ فضا میں بجلیاں کڑک جاتی ہیں ۔ اور ہوائی جہاز سرشار کرگسوں کی طرح اوپر کو اُٹھتے ہیں ۔ میری بے چین نظریں اِدھر اُدھر گھومتی ہیں ۔ اور یونیورسٹی کی ایک عمارت پر جم جاتی ہیں ۔ جہاں کالے دھوئیں اور بھوری گرد کا بادل اُٹھنے لگتا ہے ۔ چند طیارہ شکن توپیں اپنی متواتر گرج سے فضا کے پرخچے اڑاتی ہیں ۔ مگر خدا نے بھی ہم سے مُنہ موڑ لیا ہے ۔ اور ان کے وار خالی جا رہے ہیں ۔ دُشمن کے ہوائی جہاز فضا میں اِس طرح اٹھکیلیاں کرتے پھرتے ہیں ۔ جیسے دریا پر بگلے ۔ ہمارے ہوائی جہاز چھ دسمبر کے بعد نہیں اُڑ سکے ۔ اور اب دشمن کے ہوائی جہاز اس انداز میں ٹہلتے ہیں ۔ جیسے جاگیردار اپنے علاقے میں گھومتا ہے ۔ دو ایک پُر اطمینان چکّر لگانے کے بعد وہ پھر نیچے کو جھپٹتے ہیں اور دل خراش دھماکوں کے ساتھ میری کھڑکی پر لپکے آتے ہیں ۔ مَیں کیمرے کا بٹن دباتا ہوں ۔ اور ڈھاکہ کے سینے میں نئے دھوئیں تلاش کرنے لگتا ہوں ۔ یونیورسٹی، عظیم پور، دھان منڈی، فیل خانہ، یکے بعد دیگرے طیاروں کے خوفناک رقص

تلے روندے جا رہے ہیں۔

ڈھاکہ کرفیو کی آغوش میں پرسکوت ہے۔ مگر اُوپر کی فضا میں بجلیاں کڑک رہی ہیں۔ اور دھوئیں کی متعدّد زبانیں دہائی دیتے دیتے بلند سے بلند تر ہوتی جاتی ہیں۔

یہی ڈھاکہ کی جنگ ہے۔ جو سارا دِن کڑک دھمک اور چنگھاڑ سے جاری رہتی ہے۔ جس طرح مؤدب بچّہ سخت گیر اُستاد سے ڈنڈے کھاتا ہے۔ اِسی طرح خاموش اور ویران ڈھاکہ تند و تیز بجلیوں کو فرمانبرداری سے سہہ رہا ہے۔ اندازاً ہر پندرہ بیس منٹ بعد نیا حملہ ہوتا ہے۔ جو اکثر آدھ گھنٹہ تک جاری رہتا ہے۔

مَیں کبھی تو ہوٹل کی کھڑکی سے یک طرفہ جنگ دیکھتا ہوں اور کبھی ہوٹل کے اندر ان چہروں کو دیکھتا ہوں جو اس غیرجانبدار علاقے (NEUTRAL ZONE) میں پناہ گزیں ہیں۔

یہ بڑے ہی عجیب چہرے ہیں۔ اس لیے کہ قریباً قریباً اصل رنگ میں نظر آ رہے ہیں۔ جو عام حالات میں کبھی نہیں ہوتا۔ عام طور پر تو ہم چہرہ نہیں دیکھتے۔ فقط ان نقوش کو دیکھتے ہیں جو ایک چہرے کا رُوپ دھارے ہیں۔ مصلحت

کے نقوش، مہذّب مُسکراہٹ کے نقوش، ریاکاری کے نقوش، مذہبی جنون کے نقوش، موقع شناسی کے نقوش، سیاسی لیڈری کے نقوش، مگر یہ چہرے ایسے حالات میں گھرے ہوئے ہیں کہ وقت نے ان کے سارے نقاب نوچ کر پھینک دیے ہیں اور اُنہیں ابھی یہ مہلت نہیں ملی کہ مُستقبل کے لیے نئے نقاب کا انتخاب کر سکیں۔ ان چہروں کے خطوط میں تواریخ کروٹیں لے رہی ہے۔ فلسفے دم توڑ رہے ہیں۔ ذات تنکے کا سہارا تلاش کر رہی ہے اور وسوسوں کے سائے ایمان کو دُھندلا رہے ہیں۔

اس ہوٹل میں آج ہمیں دُوسرا دن ہے۔ کل صُبح گیارہ بجے کے قریب یہاں پہنچے اور اس کے بعد سے لوگوں کا مسلسل تانتا بندھا ہے۔ —— باہر قیامت ٹوٹی پڑتی ہے۔ زمانۂ نوح والی قیامت جس میں آسمان، زمین اور فضا مل کر طوفان اُگل رہے ہیں اور دِلوں اور دماغوں میں طوفانوں کے جھکڑ چل رہے ہیں۔ ہر شخص ان بیرونی اور اندرونی طوفانوں کی ہلاکت سے بچنے کے لیے بے تاب ہے۔ اور اس ہوٹل کو کشتیٔ نوح سمجھ کر بھاگا آ رہا ہے۔ ہر نیا چہرہ اندر داخل ہو کر اطمینان کا سانس لیتا دکھائی دیتا ہے۔ مگر اس کے باوجُود ہر چہرے

پر تشویش۔ خدشات اور رنج و الم کے سایوں کی نئی بے ترتیبی ہے۔ ہر نئے آنے والے کی تلاشی لی جاتی ہے۔ کہ اس کے پاس کوئی ہتھیار تو نہیں۔ تلاشی لینے والے غیر ملکی اخبار نویس وغیرہ ہیں۔ جن کو ریڈ کراس نے اس کام کے لیے رضا کارانہ طور پر ساتھ ملا لیا ہے۔ تلاشی سے فارغ ہو کر آنے والا آگے بڑھتا ہے تو لوگ اُسے گھیر لیتے ہیں اور تابڑ توڑ سوالات پوچھتے ہیں۔ کون ہیں؟ کس بستی سے آئے ہیں؟ وہاں کیا حالات ہیں؟ کوئی اُمید ہے یا نہیں؟ وُہ فارم پُر کرتے کرتے آدھے یا چوتھائی جملوں میں تشنہ سے جواب دیتا جاتا ہے۔ اور پھر ریسپشن (RECEPTION) سے چابی لے کر اپنے کمرے کی طرف گولی کی طرح بھاگتا ہے جو اس کے لیے گوشۂ عافیت بنا ہے۔

ہم بھی اِسی طرح اپنے کمروں میں پہنچے۔ جو سب سے اُوپر والی گیارھویں منزل پر ہیں۔ وہاں بمباری کی وجہ سے سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ مگر ہم مغربی پاکستانی ہونے کی وجہ سے فالتو تصوّر کیے گئے تھے۔ لہذا وہیں بھیجے گئے۔۔۔۔۔۔۔ مَیں اپنے کمرہ نمبر ۱۱۰۸ کی کھڑکی میں سے جھانکتا ہوں تو پہلا منظر جو مجھے نظر آتا ہے۔ وُہ رونگٹے کھڑے کر دیتا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔

بالکل سامنے گورنمنٹ ہاؤس پر ہوائی جہاز جھپٹ جھپٹ کر بمباری کر رہے ہیں۔ وہی گورنمنٹ ہاؤس جس میں سات روز کے قیام کے بعد ہم تھوڑی دیر پہلے وہاں سے نکلے تھے۔ ابھی ہمارے کئی ساتھی وہیں ہیں کیونکہ کابینہ کا اجلاس ہو رہا ہے[1]۔

ہم تشویش کے عالم میں فون کی طرف لپکتے ہیں۔ اور گورنر ہاؤس کا نمبر آزماتے ہیں۔ مگر کہیں سے جواب نہیں آتا۔ خدشے یقین میں بدلنے لگتے ہیں۔ اور ہم متأسف نظروں سے گورنمنٹ ہاؤس کی طرف دیکھتے ہیں جس پر کوئی طیارہ شکن توپ نہیں ہے۔ اور ہوائی جہاز بغیر کسی خطرے کے جُھک جُھک کر راکٹ پھینک رہے ہیں۔ نیچے وُہ عمارتیں دھول اور مٹی بن کر اڑ رہی ہیں۔ جنہوں نے سات آٹھ روز تک ہمیں پناہ دی تھی۔ اور پچیس سال تک مشرقی اور مغربی پاکستان کی اکائی کی علامت تھیں۔

---

[1] کوئی بیس افسروں کا گروپ صبح دس بج کر پچیس منٹ پر وہاں سے نکلا۔ قریب چالیس منٹ بعد ہوائی حملے شروع ہوئے ——— ہتھیار ڈالے جانے کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ بمباری کا پروگرام تو علی الصبح تھا مگر ہندوستانی پائلٹ فضا سے گورنمنٹ ہاؤس نہ ڈھونڈ سکے۔ اور دو دفعہ ناکام واپس چلے گئے۔ اب وُہ تیسری دفعہ آئے تھے۔

ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ یہ بمباری نہیں بلکہ علامتی انداز میں مشرقی پاکستان کا رشتہ مغربی پاکستان سے توڑا جا رہا ہے۔

وقفے وقفے سے بمباری شہر پہ اور گورنمنٹ ہاؤس پر جاری رہتی ہے۔

دو بجے کے قریب ہم نیچے اُترتے ہیں۔ تو ہمارے دو ساتھی سراسیمہ اور پریشان حالت میں لاؤنج میں کھڑے ہیں۔ یہ گورنمنٹ ہاؤس سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ اور صرف تن کے کپڑوں میں آ سکے ہیں جن پر مٹی اور دھول کے دھبے ہیں۔

وُہ اپنے سانس دُرست کرتے ہُوئے بتاتے ہیں کہ کس طرح عین اجلاس کے وقت یکدم تابڑ توڑ حملے شروع ہُوئے۔ اور گورنمنٹ ہاؤس میں لوگ جانیں بچانے کو چاروں طرف دوڑے جب وہ باہر کو لپکے تو بعض کمروں کے فرنیچر کو آگ لگ چکی تھی۔ بعض جگہ گری ہُوئی دیواروں کے ملبوں نے ان کا راستہ روک لیا۔ باہر لان میں پہنچے تو خندقیں آدمیوں سے لبا لب بھری تھیں۔ انہوں نے درختوں کے تنوں کے پیچھے پناہ لی۔ مگر چند ہی ثانیوں بعد قریب ترین درختوں کے موٹے موٹے تنوں کو چشم زدن میں اُدھڑتے دیکھ کر وُہ موٹر گاڑیوں کے نیچے گھس گئے۔ اور بالآخر

دو حملوں کے درمیان موقعہ پا کر بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔
مگر باقی گروپ شام کو پہنچا۔ لُٹے ہُوئے قافلے کی طرح پریشان حال اور ویران صورت۔ گورنر اور ان کے وزراء اس میں شامل ہیں۔انہوں نے جب بھی خندقوں اور بنکر سے نکلنا چاہا تو یا تو آسمان پر ہوائی جہاز آن موجود ہوتے۔ یا گورنر ہاؤس کے اِرد گرد کی بلند و بالا عمارتوں سے راکٹ۔ مورٹر اور مشین گن کے فائر ہونے لگے۔ یہ کئی دفعہ باہر نکلے اور کئی دفعہ خندقوں میں واپس چلے گئے۔ ان میں گورنر کا سیکرٹری[1] بھی شامل ہے۔ جو اوپر والی منزل میں اپنے کمرے میں کام کر رہا تھا۔ جب پہلا ہوائی حملہ ہوا۔ اس کے بعد سب لوگ تو بھاگ کر باہر خندقوں میں چلے گئے۔ مگر وُہ کمرہ کمرہ گھوم کر گورنر کو تلاش کرتا رہا۔ اور بالآخر ایک کمرے میں اُسے پا کر اُس کے ساتھ فرش پر لیٹ گیا۔
مَیں حیرانی سے پوچھتا ہوں۔
"آپ باہر کیوں نہیں گئے؟۔ اندر ٹھہرنا تو خطرناک تھا"
وُہ اپنے مخصوص دھیمے انداز میں کہتا ہے:"مجھے یقین تھا کہ ہمارا آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اور مَیں گورنر کے ساتھ مرنا چاہتا تھا"
اس نے اپنی آنکھوں سے دیواریں شق ہوتے دیکھیں۔ راکٹ

---

[1] سید محمد حسن

پھٹتے دیکھے۔ دُھوئیں اُبلتے اور ملبے اُڑتے دیکھے۔ ایک سنتری کو عین بمباری میں کھُلی چھت پر کھڑے ہو کر پاگلوں کی طرح ہنستے دیکھا۔ قالینوں پر آگ کے سانپ رینگتے دیکھے۔ بجلی کے تار اور پانی کے پائپ چاک شدہ پیٹ میں سے انتڑیوں کی طرح باہر کو لٹکتے دیکھے۔ بھاگتے ہوئے لوگوں کو دُھوئیں اور دھُول سے بے دم ہوتے دیکھا۔ شیشے کے خوبصُورت کیس میں تیرنے والی رنگین اور سنہری مچھلیوں کو ملبے کے ڈھیر میں تڑپتے اُچھلتے اور اپنے ہی خُون میں اور زیادہ رنگین ہوتے دیکھا۔ پُرشور بموں کے دھماکوں کے درمیان ٹیلی فون کی گھنٹی کی ننھّی منّی آواز سُنی۔ جو اس عجیب ماحول میں اور بھی پُراسرار لگی۔ کیونکہ اس چیتھڑے اڑاتی ہُوئی افراتفری میں وُہ سابقہ معمول اور ترتیب کی واحد نقیب تھی۔ سنسناتی گولیوں کو دائیں بائیں اُڑتے محسوس کیا۔ لیٹ کر۔ بھاگ کر اور اچھل کر راکٹ، مارٹر کے فائر سے بچتا رہا۔ مگر اس سب کے باوجُود وُہ انتہائی پُرسکون تھا۔ صرف تن کے ناکافی کپڑوں میں ملبوس یہ چہرہ خدُا اور قسمت پر توکل کی تصویر بنا اپنی جان بچنے کے معجزے کو ایسے بیان کر رہا تھا۔ جیسے ایک معمولی واقعہ ہو۔ حالانکہ اِرد گرد سُننے والے اندر ہی اندر لرز رہے تھے۔ کہ کہیں اُن کی بھی ایسے طوفانی لمحوں سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے۔

کل کا دن یقین ڈولنے کا دِن تھا۔ شہر کے مختلف حصّوں سے لوگ آتے گئے۔ اپنی امیدوں کی لاشوں کو سینوں سے لگائے ہوئے، فق چہروں سے، اُڑی اڑی رنگت سے، پھٹی پھٹی آنکھوں سے۔ ..... ایک کے بعد دُوسرا۔ دُوسرے کے بعد تیسرا۔ شام تک ہوٹل کھچا کھچ بھر گیا۔ لاؤنج میں۔ کھانے کے کمرے کیفے ارم میں۔ لفٹ میں۔ کاریڈور میں، ہر جگہ لوگ ہی لوگ نظر آتے تھے۔ ہوٹل کی انتظامیہ کو کھانے کے اوقات مقرر کرنے پڑے۔ مع اس اپیل کے کہ اپنی نشست جلدی چھوڑ دیں۔ اور کھانا کھانے میں غیر ضروری توقف نہ کریں۔ اس ہجُوم میں بچّے، بُوڑھے، جوان اور عورتیں سبھی شامل ہیں۔ اور یہ مرگِ انبوہ کے جشن کا نقشہ بنتا جا رہا ہے۔

اس ہجوم میں عام طور پر چار قسم کے چہرے ہیں۔

پہلی قسم غیر ملکی چہروں کی ہے۔ جو نامہ نگاروں، اخبار نویسوں اور تاجروں کا نقاب اوڑھے ہیں۔ مگر ان میں سے کافی پہلے بھی یہاں موجُود تھے۔ اور آج بھی ہیں۔ ان میں کئی ایسے ہیں جو اس دن کے لیے کام کرتے رہے ہیں اور آج پاکستان کی گردن کو آہستہ آہستہ جھکتا دیکھ کر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں۔ ان کے بظاہر متین، سنجیدہ اور لاتعلق چہرے اس وقت

"ہم بہو بیٹیاں یہ کیا جانیں" کا انداز اختیار کئے ہیں۔ مگر ان بہو بیٹیوں نے سات پردوں کے اندر ہی اندر وہ گُل کھلائے ہیں۔ کہ کل کا رقیب ہندوستان آج کا رازدان بن گیا ہے۔ اور یہ گل ہائے سیاہ رنگ زبانِ حال سے نوحہ کناں ہیں کہ ؂

اُڑا لی قمریوں نے، طوطیوں نے، عندلیبوں نے
چمن والوں نے مِل کر لُوٹ لی طرزِ فغاں میری

یہ چہرے اس چمن کی آبیاری کرنے کے رُوپ میں آتے تھے اور نہایت مہارت سے بیخ کنی کر رہے تھے۔ اور اب ہماری خزاں کو اپنی بہار بنا رہے ہیں۔ اس وقت میرے لیے سب سے زیادہ تکلیف دہ چیز اِن چہروں کا تاثر ہے۔ جو قلم کی گرفت میں نہیں آ سکتا۔ یہ لوگ کچھ عجیب سے انداز لیے گھوم رہے ہیں۔ خدُائی کا انداز، بے پرواہی کا انداز، ہرجائی کا انداز، گل چین و گل فروش کا انداز، پتلیوں کا تماشہ دکھانے والے کا اعتماد، میرِ محفل کا سا دبدبہ، برتری کا نمایاں احساس، حقارت کا دبا دبا اظہار۔ نہ معلوم ان خاموش اور متین چہروں پر کتنا پیچیدہ تاثر ہے جو پیچیدگی کے باوجُود

صاف پڑھا جاتا ہے مگر بیان نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ میرے دِل کو چھید کرتا جاتا ہے۔

کل دوپہر کے قریب ہم لوگ یہاں پہنچے تو یہ چہرے باہر گیٹ پر عجیب عجیب کیمروں سے لیس کھڑے تھے۔ ہمیں بعد میں پتہ چلا کہ یہ ہندوستانی جرنیلوں کی آمد کے انتظار میں صُبح سے گھڑیاں گِن رہے تھے۔ مگر ہم پہنچے تو انہوں نے ہر ہر زاویے سے ہماری تصویریں کھینچیں۔ اور ہم شرمندگی سے زمین میں گڑے جا رہے تھے۔ کیونکہ گو ابھی جنگ لڑی جا رہی تھی۔ مگر شکست کا آغاز دو تین روز پہلے سے ہو چُکا تھا۔ اور ہمارا یہاں آنا ڈراپ سین کا حِصّہ تھا۔ احساسِ شکست کی ساری ذلّت ہمارے جسموں پر پسینے کے قطرے بن کر رینگ رہی تھی۔ اور ان کے کیمروں کی آواز عبد العزیز خالد کے ان مصرعوں کی گونج بن رہی ہے۔ ؎

وُہ ہم کہ ہیں خس و خاشاکِ کوئے رسوائی
بغیظِ غمزۂ چالاکِ چرخِ مینائی

اور اب اس رسوائی کو دُنیا بھر میں نشر کرنے کا سامان ہو رہا ہے۔ ہمارے لیے تو وہ محشر کی گھڑی تھی مگر ان چہروں کے

ویسے تو

ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روش آب و ہوا ہے

یہ بڑے ہی بے درد اور ظالم چہرے ہیں۔ جو زیب محفل بھی رہے اور محفل سے پنہاں بھی رہے۔

اس ہوٹل میں چہروں کی دوسری قسم مغربی پاکستانیوں کی ہے۔ جن میں سرکاری ملازم، پی۔ آئی۔ اے کا سٹاف اور پرائیویٹ فرموں کے ملازمین ہیں۔ ان میں سے بعض پہلے ہی اس ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے تھے اور اب ریڈکراس کی امان میں آ گئے ہیں۔ اور بعض کل اور آج یہاں پہنچے ہیں۔ یہ چہرے اپنی ڈوبتی ہوئی کشتی کو دل پکڑ کر دیکھ رہے ہیں۔ زیادہ حصّہ ڈوب چکا ہے۔ چند ایک کنگورے سطح آب سے اُوپر ہیں۔ جنہیں یہ والہانہ انداز میں پکڑے ہوئے ہیں۔ ان کی مایوس نظریں دیکھ رہی ہیں کہ کشتی ڈوب رہی ہے۔ سمندر مگرمچھوں اور نہنگوں سے اٹا پڑا ہے۔ اور ساحل دُور ہے..... بہت دُور...... جہاں سے یادوں کے دوش پر بچّوں کے ننّھے مُنّے ہاتھ اُن کو بلا رہے ہیں۔ بیویوں کے بھیگے آنچل انہیں سہارا دینے کو بے چین

ہیں۔ مائیں اور بہنیں بلائیں لے رہی ہیں۔ مگر یہ سب "اب کیا ہوگا" کے بھنور میں غائب ہو رہا ہے۔ ان کے ذہنوں میں مارچ اور اپریل کے سارے قصّے کلبلا رہے ہیں۔ جن کے مطابق غیر بنگالیوں کے جسم سے سرنجوں سے خون نکالا گیا تھا۔ ایک آدھ عضو کاٹ کر مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ بلیڈوں سے کھال کو کھرچا گیا تھا۔ پہلے اپنی قبر کھدوا لی گئی تھی۔ اور پھر مارا گیا تھا۔ بار بار زندگی کی اُمید دلوا کر پیٹ میں رام داؤ گھونپے گئے تھے۔ مگر یہ چہرے بڑے استقلال سے ان خیالات کو اپنے ذہن سے جھٹک رہے ہیں۔ اپنی پھیکی مسکراہٹوں سے حوصلے کے ملبے کو ڈھانپنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ان میں سے بعض اپنی خوابوں کی بشارت کا ذکر کر رہے ہیں۔ بعض شاہ نعمت اللہ کی آٹھ سو سال پہلے کی پیشین گوئیوں کا سہارا لے کر آخری دم تک معجزے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اور بعض پابندی سے نمازیں پڑھ کر دُعاؤں میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کئی ہاتھوں میں لمبی لمبی تسبیحیں نظر آتی ہیں۔ اور ہونٹ مسلسل ہِل رہے ہیں۔ یہ انسان سے مایوس ہو کر انسان بنانے والے سے رجوع کر

رہے ہیں۔ لیکن انسان بنانے والے نے انسانوں کے لیے کچھ ابدی اُصول بنائے ہیں۔ اور جو ان اُصولوں سے انحراف کرتا ہے وُہ وقت کی گہری لحد میں جا سوتا ہے۔

خلق ہے صفحۂ عبرت سے سبق ناخواندہ

افسوس یہ ہے کہ کسی چہرے پر وُہ غرور اور فخر نظر نہیں آتا۔ جو اپنے ملک کی بقا کے لیے آخری دم تک لڑ کر ہارنے میں ہوتا ہے۔ شاید کشتی کے ڈوبنے سے پہلے ہی اُن کے یقین ڈول گئے تھے۔ یا شاید اس ابتری اور دھاندلی نے انہیں پہلے ہی ادھ مُوا کر دیا تھا۔ جو پچھلے چند برسوں سے کسی خوفناک عفریت کی طرح اس قوم کی ہر زندہ روایت اور جاندار ڈھانچے کو ہڑپ کر رہی تھی وجہ کوئی بھی ہو۔ اب ان کی باتوں میں دُعا کے علاوہ احتجاج بھی ہے کیونکہ جن کو یہ کل تک پُورے ولی سمجھتے تھے وُہ اب پُورے بادہ خوار نظر آنے لگے ہیں۔

یہ چہرے مستقل اور مسلسل ریڈیو سے چپکے ہُوئے ہیں پاکستان کی خبریں۔ ہندوستان کی خبریں۔ امریکہ کی خبریں بی بی سی کی خبریں۔ ریڈیو آسٹریلیا کی خبریں۔ غرض کوئی وقت ایسا نہیں

جب یہ خبریں نہیں سُنتے۔ جب یہ کہا جاتا ہے۔ کہ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ آبنائے ملاکا سے گزر کر خلیج بنگال میں داخل ہو گیا ہے۔ اور شمالی سرحد پر چینی فوجیں حرکت کر رہی ہیں تو ان میں سے بعض چہرے دمک اُٹھتے ہیں۔ مگر کئی ایسے بھی ہیں جو ہوائی جہازوں سے مسلسل بجلیاں گرتے دیکھ کر مایوسی سے سر ہلاتے ہیں۔ ؎

بہار اب آ کے کیا کرے گی کہ جن سے تھا جشنِ شعر و نغمہ
وُہ گُل سرِ شاخ جل گئے ہیں وُہ دِل تہِ دام بجُھ گئے ہیں

ایک غیر ملکی خاتون نامہ نگار ان خبروں پر کندھے اچکاتی ہے۔ وُہ جنگی وقائع نگار ہے۔ اور اپنی زندگی میں پانچ شہروں کا غروب دیکھ چکی ہے جن میں DI EN BHEIN PHU بھی شامل ہے۔

"ہر غروب کی رسم ہے کہ آخری وقت میں ایسی حوصلہ افزا خبریں اُڑتی ہیں۔ مگر مَیں نے ہر دفعہ یہی دیکھا ہے کہ ڈوبنے والے کو کوئی بچانے نہیں آیا۔ ...... کسی کو آنا ہوتا تو اب تک آ چکا ہوتا۔ تاکہ دونوں اکٹھے تیرتے مگر اب لاش کو سینے سے لگانے کون آئے گا۔"

اس کی باتیں تیر بن کر ہمیں چھیدتی ہیں۔ مگر کتنی صحیح ہیں اس کی باتیں .... کیونکہ ہر زمانے نے سکھایا ہے۔

ہے جُرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

جس سر نے صرف کندھے پر ٹکنا سیکھا ہو۔ وُہ سربلندی بھُول جاتا ہے۔ اور وہ کندھے سیر ہونے کے بعد دُوسرے سر ڈھونڈنے لگتے ہیں۔

اس ہجُوم میں چہروں کی تیسری قسم مشرقی پاکستان کے لوگوں کی ہے۔ زیادہ تر ایسے لوگوں کی جنھوں نے تن، من اور دھن سے پاکستان کی حمایت کی۔ اور آخر وقت تک حکومت کا ساتھ دیا۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو پاکستان کے آیڈیل پر نہ صرف یقین رکھتے تھے۔ بلکہ ملّاحوں پر اعتماد نہ ہونے کے باوجود ڈوبتی کشتی کو بچانے کے لیے اپنا سب کچھ چھوڑ کر آ گئے۔ یہ اس یقینِ محکم کے سہارے لڑتے رہے کہ ؎

الم نصیبوں، جگر فگاروں

کی صُبح افلاک پر نہیں ہے

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں

سحر کا روشن افق یہیں ہے۔

اس سحر کی لگن میں یہ ہر قسم کی تاریکی سے نبرد آزما ہونے کو تیار تھے۔ مارچ کے بعد یہ چیخ چیخ کر بہت کچھ کہتے رہے مگر ان کی ایک نہ سُنی گئی۔ اور اس کے باوجود یہ پاکستان کی حمایت میں لڑتے رہے۔ ان کو خطوں میں دھمکیاں ملیں ٹیلیفون پر گالیاں دی گئیں۔ گھروں میں بم پھینکے گئے۔ سرِراہ قتل کیا گیا مگر یہ ڈٹے رہے۔ ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لیے مَیں اپنے ذہن کے ورق اُلٹتا ہوں۔ اور ستمبر کے مہینے میں ایک ایسے ہی چہرے سے ملاقات یاد آتی ہے۔

وُہ بہت ذمہ دار اور سمجھ دار بنگالی تھا۔ اپنے علاقے میں اس کا اُونچا مقام تھا۔ اور وُہ آنکھوں میں آنسو بھر کر کہہ رہا تھا۔

"ہم نے اپنے ملک کو آئیڈیو لوجیکل ملک کہا اور سیکولر انداز میں چلایا۔ ہندوستان نے اپنے ملک کو سیکولر کہا۔ اور آئیڈیو لوجیکل انداز میں چلایا۔ ...... منافق وُہ بھی تھے۔ منافق ہم بھی تھے .... مگر وُہ ہم سے بہتر منافق نکلے۔"

مَیں اس سے بحث کرنے کی بجائے اُسے بولنے دیتا ہوں۔ کیونکہ وُہ دِل کا غبار نکالنے پر تُلا ہُوا ہے۔ وُہ کئی باتیں سُناتا ہے۔ اُسے سب سے زیادہ گلا یہ ہے کہ کوئی ان کی باتوں پر کان نہیں دھرتا۔ ایک دفعہ جوش میں کہتا ہے۔

"مَیں نے تو کئی ذمّہ دار لوگوں سے کہا ہے۔ کہ اگر آپ اس ملک کو بچانا چاہتے ہیں تو خدا کے لیے کبھی ہماری بات بھی سُن لیا کریں۔ اس لیے کہ آپ لوگ ادھر سے آئے ہیں اور آپ کو ساری باتوں کا علم نہیں ...... اور اگر آپ اس ملک کو ختم کرنا چاہتے ہیں تو پھر اپنی چلائیں۔"

مَیں تڑپ اُٹھتا ہوں اور ایک دم ٹوک دیتا ہوں۔

"آپ کو یہ خیال کیوں آیا کہ کوئی اس ملک کو ختم کرنا چاہتا ہے"

وُہ چند لمحے سوچ میں پڑ جاتا ہے۔ پھر الفاظ تولتا ہے۔ اور بالآخر کہتا ہے۔" اس لیے کہ .... ہمیں دِن بدن .... یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہاں کے حالات سدھارنے کی کوئی کوشش نہیں ہو رہی....."

"مگر کیوں؟ .... آخر کیا وجہ ہو سکتی ہے۔

کہ حالات نہ سدھارے جائیں۔"

وُہ چند لمحے چُپ ہو جاتا ہے اور پھر اپنے ماتھے پر انگلی رکھ کر گھماتا ہے "بس بھائی صاحب! یہاں آ کر ہمارا بھی دماغ چکرا جاتا ہے......"

مگر اس بد اعتمادی کے باوجُود وُہ پاکستان کے لیے ہر قربانی دینے کو تیار ہے۔ "صاحب آپ کا کیا ہے۔ اگر یہاں کچھُ ہو جاتا ہے۔ تو آپ لوگ تو مغربی پاکستان چلے جائیں گے۔ مگر ہم تو یہاں کے ہیں۔ ہم کدھر جائیں گے۔ اگر ہم نے ہندو کی غلامی سے بچنا ہے تو سب کچھ قربان کریں گے۔ اور پاکستان کے لیے لڑیں گے۔"

اس کے جوش اور جذبے کو دیکھ کر مَیں خُدا کا شکر ادا کرتا ہوں۔ مگر اس کی مایوسی اور شکوک سے کانپ اُٹھتا ہوں۔ مَیں اس سے متفق نہیں ہوں۔ اور اپنے طور پر سمجھانے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ مگر اس کی خاموشی میں انکار صاف جھلک رہا ہے۔

ستمبر.......... اور.......... دسمبر!!!

اِسی طرح مجھے نومبر کا مہینہ یاد آتا ہے۔ جب عید سے

دو روز پہلے ڈھاکہ میں کرفیو لگایا گیا تھا۔ تو میری ملاقات ایک ایسے ہی چہرے سے ہوئی تھی۔ اس نے جل کر صرف اتنا ہی کہا تھا۔

"پچھلے چھ سات ماہ میں یہ پہلا قدم ہے جس سے ہم لوگوں کی حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔ ورنہ تو یوں شک پڑتا تھا کہ ہر قدم شرپسندوں کی حوصلہ افزائی کے لیے اُٹھایا جاتا تھا۔"

اس بداعتمادی کے باوجود ان چہروں نے ہر خطرے کو مول لے کر لبیک کہا۔ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو اس وقت بھی ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بنگلہ دیش کی مخالفت اور پاکستان کی حمایت میں تقریریں کر رہے تھے۔ جب ہندوستانی فوجیں ڈھاکہ کے دروازوں پر دستک دے رہی تھیں یہ جانتے ہوئے بھی کہ اگلے چند دنوں میں ان کی لاشیں گلی کوچوں میں پڑی ہوں گی۔

آج جب میں ان چہروں پر نظر ڈالتا ہوں تو یہ زندہ لاشیں لگتی ہیں۔ زندگی کی کوئی رمق ان میں باقی نہیں رہی۔ کھانے کے کمرے میں خالی خولی نظروں سے میز کو دیکھتے ہوئے یہ

خاموشی سے نوالے چباتے رہتے ہیں۔ یا لاونج میں صُوفوں پر چُپ بیٹھ کر اپنے وسوسوں کو دبانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ یا لفٹ میں فرش پر نظریں گاڑھے اپنے کمروں کو چلے جاتے ہیں۔ یہ باتیں بھی کرتے ہیں۔ مگر صرف ہونٹوں سے، کیونکہ ان کے دماغ فوری خطروں کے جھپٹتے ہُوئے سایوں سے لمحہ بھر بھی نہیں بچ سکتے۔ یہ مُسکراتے بھی ہیں مگر ایسی مُسکراہٹ جو دَرد کو چھپانے کے لیے مشینی انداز میں پیدا کی جاتی ہے۔ ان میں سے کئی ایک کے ساتھ بیویاں، جوان بیٹیاں اور چھوٹے بچّے بھی ہیں۔ مگر یہ ان سے مجرموں کی طرح آنکھیں چُرا رہے ہیں۔ ان کے لیے ہر طرف تاریکی ہی تاریکی ہے۔

وُہ تیرگی ہے رہِ بُتاں میں، چراغِ رُخ ہے نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب درو بام بُجھ گئے ہیں۔

مگر ہم ان کے لیے کوئی کرن نہیں پیدا کر سکتے۔ رسمی طور پر بھی نہیں۔ کیونکہ حقیقت بہُت بھیانک ہے اور اس کے نوکیلے ناخن ہماری گردنوں تک پہنچ رہے ہیں۔

اس ہجوم میں چہروں کی چوتھی قسم عام اصطلاح میں

"بہاری" کہلاتی ہے۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو ۱۹۴۷ء میں بہار، آسام
یوپی اور سی پی وغیرہ سے ہجرت کرکے مشرقی پاکستان آئے
اور دُوسرے درجے کے شہری بن گئے۔ یہ چہرے بُہت ہی
مظلوم ہیں۔ اِتنے مظلوم کہ ہند و پاکستان کی مُسلم قوم کا
کوئی طبقہ اتنا مظلوم نہیں۔ انہوں نے پاکستان کی تحریک میں
بڑھ چڑھ کر حِصّہ لیا۔ یہ جانتے ہُوئے بھی کہ ان کے علاقے
پاکستان میں نہیں ہوں گے بلکہ ہندوستان میں رہ جائیں گے۔
۱۹۴۷ء میں یہ اپنے عزیزوں کی لاشوں پہ تیرتے ہُوئے خوُن کے
سمندر پار کرکے یہاں پہنچے۔ مارچ - اپریل ۱۹۷۱ء میں اس
سے بھی بُرے دِن دیکھے۔ جب خود مسلمانوں کی بربریت
ہندوُوں کے مظالم سے کہیں آگے بڑھ گئی۔ اوراب دسمبر
۱۹۷۱ء کے بعد پھر ان کے خوُن سے ہولی کھیل جائے گی۔
یہ لوگ ایک ہی نسل میں تین قتلِ عام سہہ کر بھی بے گھر
ہی ہیں۔ پاکستان کی لڑائی میں انہوں نے بھر پُور حِصّہ لیا۔
اور اب تک پِٹتے رہے ہیں۔ مگر پاکستان انہیں تحفّظ نہ
دے سکا۔ گھر نہ دے سکا۔ وطن نہ دے سکا۔ گو اُن کی
رگوں میں پاکستان کا خوُن موجزن ہے۔

ہم سیہ بخت ہیں پھر بھی تو یہ کرتے ہیں کمال
خوُد اندھیرے میں ہیں اوروں کو دکھاتے ہیں چراغ

ایک ایسا ہی چہرہ میرے ساتھ کھانے کی میز پر بیٹھا ہوُا ہے یہ دو آدمیوں کی میز ہے۔ اور تیسرا کوئی نہیں۔ پھر بھی ہم دونوں خاموشی سے کھانا کھا رہے ہیں۔ حالانکہ ہم ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اس کا چہرہ انتہائی سنجیدہ ہے۔ اس پر کئی رنگ آ رہے ہیں اور جا رہے ہیں۔ اندرُونی کرب اس کے روئیں روئیں سے جھانک رہا ہے۔ کبھی کبھی اِس کے ہونٹ ہِلنے لگتے ہیں۔ مَیں چند لمحے اسے کنکھیوں سے دیکھتا رہتا ہوں۔ اور پھر محض اِس کا خیال بٹانے کو بات چلاتا ہوں۔

"آپ کیا پڑھ رہے ہیں۔"

وُہ چند لمحے ایسے کھاتا رہتا ہے۔ جیسے میری بات ہی نہیں سُنی۔ پھر ایک دم چونک کر کہتا ہے۔

"مَیں؟...... نہیں..... کچھُ نہیں۔"

مگر آپ کے ہونٹ ہِل رہے ہیں۔

"ہاں...... مگر کوئی خاص چیز نہیں۔"

"اگر کوئی دافع بلا دُعا ہے تو مجھے بھی بتایئے......
یہ وقت تو سب پر کڑا ہے۔"

وُہ چھُری کانٹا پلیٹ میں رکھ دیتا ہے۔ اور دونوں ہاتھ پلیٹ کے اِرد گرد میز پر ٹکا کر ذرا سا آگے جُھکتا ہے۔

"دُعا؟ ؟...... کِس سے ؟"

"خُدا سے"۔ مَیں ذرا حیرانی سے کہتا ہوں۔

وُہ چُپ ہو جاتا ہے........ پھر ایک ایک لفظ دبا کر کہتا ہے۔" مَیں نے پہلی دفعہ بہُت دُعا مانگی تھی...
...... دُوسری دفعہ اُس سے بھی زیادہ........ اور اب تیسری دفعہ......... مَیں کوئی دُعا نہیں مانگوں گا۔"
میری سمجھ میں بات نہیں آتی۔ مگر مَیں خاموش رہ کر اسے بولنے کا موقع دیتا ہوں۔

وُہ چند لمحے اِسی انداز میں ساکت بیٹھا رہتا ہے۔ پھر ہولے ہولے چھُری کانٹا اُٹھا کر نوالہ مُنہ میں ڈالتا ہے۔ مَیں خاموش رہتا ہوں اور محسُوس کرتا ہوں کہ وُہ انتہائی ضبط سے کام لے رہا ہے۔

باہر بمباری کے دھماکے سُنائی دیتے ہیں اور ہوائی جہاز کی چنگھاڑ کانوں کے پردے پھاڑتی ہوئی غائب ہو جاتی ہے...... پھر وُہ خود ہی بول اُٹھتا ہے۔

"۱۹۴۷ء میں ہمارے خاندان کے سترہ لوگ مارے گئے تھے........ اِس اپریل میں پچیس لوگ مارے گئے..... اور اب....... اب باقی سب مارے جائیں گے...... میرے خاندان کا نشان بھی باقی نہ رہے گا۔"

مَیں اُسے تسلّی دینا چاہتا ہوں مگر الفاظ نہیں ملتے۔ اور ہم پھر کھانا کھانے لگتے ہیں۔

چند منٹ گزر جاتے ہیں....... بوجھل منٹ...... اور پھر وُہ مجھے مخاطب کیے بغیر میز پر مکّا مارتا ہے۔

"مَیں کہتا ہوں میرا کیا قصُور ہے؟...... میرے خاندان کا کیا قصُور ہے؟"

مَیں دماغ میں جلدی جلدی سوچتا ہوں کہ کیا کہوں تاکہ اس کا ذہنی کھچاؤ کم ہو۔ جب کچھ نہیں سُوجھتا تو موضوع کو پھیلانے کی کوشش کرتا ہوں۔

"ہاں یہ بُہت، بڑا المیہ ہے...... مگر قوموں کے اعمال

کی سزا ......"

وُہ خشمگین آنکھوں سے میری طرف دیکھتے ہُوئے ایک دم بات کاٹ دیتا ہے۔" دیکھئے صاحب! سزا اور جزا کا مسئلہ اپنے پاس رکھئے۔ مجھے معلوم نہیں قوموں کے ساتھ کیا ہوتا ہے .... میں تو یہ جانتا ہوں کہ اپریل میں میرا دو سالہ بچّہ مارا گیا...... اور اب .... میرا تین ماہ کا بچّہ مارا جائے گا........ ان کو کس عمل کی سزا مل رہی ہے۔ .... اور اس عمر میں ان کے اعمال کیا ہیں؟..... اور اگر یہ قوم کو سزا ہے تو اس کے لیے ہر دفعہ میرا ہی گھرانا کیوں چنا جاتا ہے؟....... قوم میں اور لوگ نہیں ہیں کیا؟"

وُہ مجھے گھُورتا رہتا ہے .... اور میں نظریں جھُکا لیتا ہوں۔

پھر وُہ ہولے ہولے چھُری کانٹا اٹھاتا ہے..... اس کے ہاتھ کانپ رہے ہیں۔

وُہ بڑی مشکل سے ایک نوالہ مُنہ میں لیتا ہے.... اور پھر کھانا ختم کئے بغیر ایک دم اُٹھ کر کمرے میں چلا

جاتا ہے۔ مَیں جانتا ہوں وُہ اپنے کمرے میں گیا ہے۔۔۔۔۔
مَیں پیچھے جا کر اس کو تسلّی دینا چاہتا ہوں۔ مگر پھر خیال
آتا ہے۔ کہ وُہ کمرے میں رونے گیا ہے۔۔۔۔۔۔ اسے
رونے دوں۔ ورنہ وُہ پاگل ہو جائے گا۔۔۔۔۔۔۔ اور
جسے بعد میں رونے والا کوئی نہ ہو۔ اسے مرنے سے پہلے یہ
رسم خُود پُوری کر لینی چاہیئے۔ ؎

زندگی اپنی جب اس شکل سے گزری غالب
ہم بھی کیا یاد کریں گے کہ خُدا رکھتے تھے

آج پندرہ دسمبر ۱۹۷۱ء ہے اور چاروں قسم کے یہ
چہرے میرے گرد و پیش گھوم رہے ہیں۔ لفٹ میں، کاریڈور
میں، کاؤنٹر پر، لاؤنج میں، کھانے کے کمرے کیفے ٹیریا میں،
۔۔۔۔۔۔۔ متوحش نظریں، متفکر پیشانیاں اور متنازعہ خیالات۔
ان کے گروپ چاہے مختلف ہوں مگر پہلی قسم کے غیر ملکی
چہروں کے علاوہ باقی سب میں تشویش قدرِ مشترک ہے جس
میں قوم و ملک کا احساسِ زیاں، اور ذات کا تحفّظ بھی
شامل ہیں۔ ان کے ہونٹوں سے صرف دُعائیں ہی نہیں نکل
رہیں۔ بلکہ ایسی باتیں بھی نکل رہی ہیں۔ جنہیں کہنے سے انہوں

نے ہمیشہ گریز کیا۔ ادر اب آخری وقت میں انہوں نے شاعر کا مسلک اختیار کیا۔ کہ

جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وُہ سب کچھُ برملا کہیئے

مگر اب اس کی حیثیت ایک وصیّت سے زیادہ نہیں۔

اب نوا پیرا ہے کیا، گلشن ہوا برہم ترا
بے محل تیرا ترنّم، نغمہ بے موسم ترا

ان کی باتیں سُنتے ہُوئے میں سوچتا ہوں کہ اگر یہ قوم گزشتہ چوبیس برس میں حاکمِ وقت کی مدح سرائی کی بجائے کھُل کر بات کرنے کی عادت ڈال لیتی۔ تو آج ہمیں یہ دِن نہ دیکھنا پڑتا۔ حاکموں نے قوم کے دامن کی دھجیاں اڑائیں، مگر قوم کو حاکم کا گریبان پکڑنے کی ہمّت نہ پڑی۔ ہم نے مذہب سے لے کر سیاست اور پھر روز مرّہ زندگی تک ہر چیز کے لیے ایک ہی پیمانہ رکھا۔ اور وُہ تھا مصلحتِ وقت کا پیمانہ، جس نے صرف قصیدوں کو جنم دیا۔ بہُت کیا تو الزام۔ اس سے آگے گئے تو دشنام۔ مگر احتساب کبھی نہیں...... کبھی بھی نہیں۔ جب خود احتسابی نہ ہو تو خُدا محتسب باہر سے بھیجا کرتا ہے۔ یہ ابدی قانون ہے۔ تواریخی حقیقت ہے۔

اور بار بار دہرائی جانے والی روایت ہے۔

آج پندرہ دسمبر ہے........ وہی دسمبر جس میں ہمارے صدر کی طرف سے انتقالِ اقتدار کے اعلان کا وعدہ ہے۔ .... اور میری آنکھیں اس اقتدار کو منتقل ہوتے ہوئے دیکھ رہی ہیں۔........ مگر کیسے ؟؟؟

بمباری کے باوجود وحشتِ دل سے گھبرا کر نیچے اُترتا ہوں اور باہر مین گیٹ کے پاس آ جاتا ہوں۔ جہاں سارے غیر ملکی فوٹو گرافر اور نامہ نگار جمگھٹا بنا کر کھڑے ہیں۔ پچھلے دو دِن سے لگا ہُوا کرفیوُ تین گھنٹے کے لیے اُٹھایا ہُوا ہے۔ اس لیے سڑک پر اکّا دُکّا موٹر اور دو چار آدمی نظر آتے ہیں۔ گیارہ بجنے کو ہیں اور بارہ بجے پھر کرفیو لگ جائے گا۔ مَیں چل کر فوٹو گرافروں کے پاس جاتا ہوں اور ایک سے پوُچھتا ہوں۔ "کیا ہُوا ؟" وُہ میری بات کا جواب دینا کسرِ شان سمجھتا ہے۔ ...... مَیں دُوسرے سے پوُچھتا ہوں۔ وُہ کہتا ہے کہ جلدی سے آگے سے ہٹ جاؤ۔ کیونکہ پاکستانی جرنیل ہتھیار ڈالنے کے لیے یہاں آ رہے ہیں۔

مَیں تڑپ اُٹھتا ہوں۔ "مگر یہاں کس کو ہتھیار ڈالیں

گے۔ ...... یہاں کون ہے؟"

وُہ میری بات کا جواب دیے بغیر آگے بڑھ جاتا ہے۔ مجھے ایک پاکستانی جرنلسٹ نظر آتا ہے۔ مَیں لپک کر اُس کے پاس جاتا ہوں۔ وُہ گالیاں دیتے ہُوئے کہتا ہے کہ یہ لوگ محض ڈرامہ کر رہے ہیں۔ پچھلے چار روز سے اسی طرح اکٹھے ہو جاتے ہیں۔ دو تین گھنٹے انتظار کرتے ہیں۔ اور پھر واپس کمروں میں چلے جاتے ہیں۔ مگر کچُھ بھی نہیں ہوتا۔

ابھی ہم دونوں باتیں کر رہے ہیں کہ ایک لمبا سا غیر ملکی جرنلسٹ باقی سب کو اکٹھا کرکے تقریر شروع کر دیتا ہے۔

"حضرات! ابھی ہم تواریخ کا ایک اہم موڑ دیکھنے والے ہیں۔ ایک بُہت بڑا واقعہ۔ جس کا ساری دُنیا انتظار کر رہی ہے۔ مَیں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ یہ بُہت بڑی خبر ہو گی۔ مگر اس تواریخی لمحے میں آپ سے استدعا کرتا ہوں کہ بدنظمی کا مظاہرہ نہ کریں۔ مَیں جانتا ہوں کہ آپ میں سے ہر ایک اس لمحے کو اپنے کیمرے میں منتقل کرنے کے لیے بے تاب ہو رہا ہے۔ لیکن ایسا نہ ہو کہ ہڑبونگ میں ہم سب

اس سے محروم رہ جائیں۔ اس لیے میں درخواست
کرتا ہوں کہ گیٹ کو سامنے رکھ کر آپ لوگ ابھی
سے اس انداز میں پوزیشن لے لیں۔ کہ ایک شخص
دُوسرے کے کیمرے کے سامنے حائل نہ ہو۔ آپ لوگوں
نے ہمیشہ تنظیم کا ثبوت دیا ہے۔ براہِ کرم اب
بھی دیجئے۔"

اس کی بات ختم ہوتے ہی فوٹو گرافر پھیل جاتے ہیں۔ ایک اینٹیں جوڑ کر ان پر چڑھ جاتا ہے۔ دُوسرا ستون کے ساتھ لگ جاتا ہے۔ اور اپنے کیمرے والے ساتھی کو کندھے پر چڑھا لیتا ہے۔ تیسرا نارکول کا خالی ڈرم لڑھکا کر لاتا ہے اور اس پر چڑھ کر کیمرہ سنبھال لیتا ہے۔ ایک گملے کو الٹا کرکے اوپر چڑھ جاتا ہے۔ کوئی اور کار کے انجن پر چڑھ جاتا ہے۔ اور باقی اِدھر اُدھر بکھر کر جگہ سنبھال لیتے ہیں۔

وُہ ایک دُوسرے سے فاصلے پر کھڑے ہوئے ہی بلند آواز میں مذاق کر رہے ہیں۔ اور قہقہے لگا رہے ہیں۔

انتقالِ اقتدار............ اور.......... دسمبر کا مہینہ.....
....

رات کے وقت مے پیئے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں خدا کرے، پر نہ کرے خدا کہ یوں

نہ معلوم مجھے تیسری قسم والے بنگالی چہرے سے ستمبر والی ملاقات کیوں یاد آنے لگتی ہے !!!

پاکستانی جرنلسٹ کی بات درست نکلتی ہے۔ وہ لوگ آدھ پون گھنٹہ ویسے ہی کھڑے رہتے ہیں۔ اور پھر واپس آجاتے ہیں......... ایک جرنیل آئے تھے۔ مگر صرف گورنر سے مشورہ کرنے۔

مگر میں بہت پہلے اندر آجاتا ہوں۔ لفٹ میں اوپر جاتے وقت مجھے خیال آتا ہے۔ کہ اکیس نومبر کو جب ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کیا تھا۔ تو چند روز بعد ہم لوگوں نے فال نکالی تھی۔ میں اپنے کمرے میں چند دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ایک دو دوستوں کی بیگمات بھی تھیں۔ اور غالباً یہ خواتین ہی کی وجہ سے تھا کہ بات قرآن میں سے فال نکالنے پر شروع ہو گئی۔ کسی نے کہا کہ کل صبح کی نماز کے بعد نکالیں گے۔ مگر میں نے کہا کہ لوگ تو دیوانِ حافظ سے بھی فال نکال لیتے ہیں۔ وہ تو یہاں نہیں ہے۔ لیکن دیوانِ غالب ہے۔

کیوں نہ اس سے فال لی جائے۔

سب ہنسے اور مذاق ہی مذاق میں کام شروع ہو گیا۔ ایک خاتون نے کچھ آیات پڑھنے کے بعد دیوانِ غالب کھولا۔ اور فال لی۔ ساتویں لائن پر یہ شعر تھا۔ ؎

پیکرِ عشاق سازِ طالع ناساز ہے

نالہ گویا گردشِ سیارہ کی آواز ہے

جس طرح مذاق میں کام شروع ہوا تھا۔ اسی طرح مذاق میں بات ٹل گئی۔ مگر آج باہر کا منظر دیکھنے کے بعد مجھے وہ شعر بار بار یاد آ رہا ہے۔ گو ابھی بھی یقین نہیں کہ آج یا کل ہتھیار ڈالے جائیں گے۔ ہمارا خیال ہے کہ شاید چھ سات روز مقابلہ کر سکیں گے۔

باہر بار بار سائرن ہو رہا ہے۔ بار بار ہوائی حملے ہو رہے ہیں۔ اور طیّارے جھپٹ جھپٹ کر دھان منڈی، فیل خانہ، عظیم پُور اور گورنمنٹ ہاؤس پر تباہی برسا رہے ہیں۔ ساری فضا دھماکوں سے چنگھاڑ رہی ہے۔ ہوٹل کے اندر عجیب قسم کا تناؤ ہے۔ چہرے سنجیدہ ہیں۔ لب خاموش ہیں۔ مگر صاف ظاہر ہے کہ بیرُونی دھماکوں سے زیادہ اندرونی آگ میں سلگ

رہے ہیں۔ کچھ لوگ لاؤنج میں صوفوں پر بیٹھے ہیں۔ خاموش اور گُم سُم، کبھی کبھار ایک آدھ فقرہ اِدھر سے اُدھر چل پڑتا ہے۔ .... کوئی قدِ آدم سے بھی بڑے شیشوں سے باہر جھانک رہا ہے۔ شیشوں پر پلاسٹک اور کپڑے کے چوڑے چوڑے فیتے چپکائے گئے ہیں۔ "تاکہ بم کے اثرات سے نقصان کم ہو۔ اِدھر اُدھر ایک دو لوگ آپس میں کھڑے ہو کر دبی آواز میں بات کر رہے ہیں۔ کوئی شخص ایک گروپ سے نکل کر دُوسرے گروپ میں چلا جاتا ہے۔ کوئی آدمی لفٹ میں سے نکل کر قریب ترین گروپ میں اٹک جاتا ہے۔ کوئی گروپ کو چھوڑ کر سر جھکائے لفٹ کی طرف چلا جاتا ہے۔ کوئی ریڈکراس کے دفتر کی طرف بھاگا جا رہا ہے۔ کہ کیا ہم اپنی خیریت کی اطلاع مغربی پاکستان بھجوا سکتے ہیں۔

اتنے مختلف لوگ۔ اتنے مختلف گروپ۔ باتوں کے اتنے مختلف انداز۔ مگر باتیں سب کی ایک ہیں۔ ریڈیو پر کیا سُنا؟ کشمیر میں کتنا اندر گئے ہیں؟ اکھنور کتنی دُور ہے۔؟ کب جنگ بندی (CEASEFIRE) ہو گی یا ہتھیار ڈالے جائیں گے؟ کیا ڈھاکہ کی جنگ اتنے دن چل سکے گی کہ مغربی پاکستان میں

اس کا فائدہ اُٹھایا جائے؟ سیکورٹی کونسل میں کتنے ریزدلیوشن ہیں۔؟ دو یا پانچ؟ کونسا ریزدلیوشن وی ٹو (VETO) ہونے کے امکانات ہیں؟ امریکہ نے کیا کہا؟ چین نے کیا کہا؟ ساتواں بحری بیڑہ کتنی دُور ہے؟ وُہ کیوں آ رہا ہے؟ چین کی فوج ابھی تک کیوں نہیں آئی؟..........

پھر کوئی سر جھٹک کر بے چارگی اور بے صبری سے پکار اُٹھتا ہے "سیکورٹی کونسل والے جلدی کیوں نہیں کرتے؟"

اور مجھے فیض کا شعر یاد آنے لگتا ہے۔

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

مگر بین الاقوامی سیاست میں انصاف ڈھونڈنا عبث ہے ...... ہم بھی خوب لوگ ہیں۔ اصُول یہ ہے کہ لوگ اپنے ملک کی سیاست میں انصاف برتتے ہیں۔ اور بین الاقوامی سیاست میں اپنا مفاد دیکھتے ہیں۔ مگر ہمارے ہاں اُلٹ رہا ہے۔ ہم ملک کی سیاست میں صرف اپنا ذاتی مفاد دیکھتے رہے ہیں۔ اور انصاف کو قریب نہیں بھٹکنے دیا۔ مگر بین الاقوامی سیاست میں انصاف کی دُہائی دیتے رہے ہیں۔ اسے کج ادائی کہیئے یا

ریاکاری۔ مگر نتیجہ یہ ہے کہ ہم دُوسروں کے مشتاق اور دوسرے ہم سے بیزار۔ اور پھر ہمیں ہی سمجھ نہیں آتی کہ یا الہٰی یہ ماجرا کیا ہے۔ ؎

اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدُا

آج سب چہرے فوجی پوزیشن کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ ہماری فوجیں ہر جگہ سرحدوں پر لڑ رہی ہیں۔جیسور، ہی لی، دیناج پور، میمن سنگھ، سلہٹ، لکشم اور ہمارا ریڈیو بار بار اسی چیز کا ذکر کر رہا ہے۔ مگر جو چیز ریڈیو نہیں بتاتا وُہ یہ ہے۔ کہ یہ فوجیں چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں لڑ رہی ہیں۔ اور ہندوستانی فوجیں ہماری فوج کو وہیں لڑتا چھوڑ کر خالی جگہوں سے اندر گھُس آئی ہیں۔ خصُوصاً کومیلا کی طرف سے۔ اور پھر دُشمن نے پیراشوٹ کے ذریعے اور ہیلی کوپٹر سے نرسنگدی اور ٹنگا ئیل کے علاقے میں فوجیں اُتار دیں۔ ہماری فوجیں سرحد پر لڑتی رہیں۔ اور یہ ڈھاکہ کی طرف بڑھنے لگے۔ صرف اب سے چند گھنٹے پہلے ریڈیو پر بتایا گیا کہ مشرقی پاکستان میں صُورتِ حال سنگین ہے۔ مگر تفصیلات نہ تھیں۔

یہ چہرے حیرت کے ساتھ کرب میں ڈُوبے ہوُئے ہیں۔

کہ یہ سب کچھ کیسے ہو گیا۔ جنگ سے پہلے جو باتیں سُنتے تھے۔ اس کے مطابق مشرقی پاکستان کی جنگ کو کئی مہینے چلنا تھا۔ یہ کوئی ڈھکا چھپا راز نہ تھا بلکہ بچّے بچّے کی زبان پر تھا۔ کہ پہلے سرحدوں پر لڑائی ہو گی۔ پھر فوجیں آہستہ آہستہ پیچھے ہٹیں گی۔ اور دریائے برہم پتر اور میگھنا شمالی سرحد کے ساتھ مل کر جو تکون بناتے ہیں۔ وہاں دوسری ڈیفنس لائن ہو گی۔ اور جب وہ ٹوٹے گی تو ڈھاکہ کی جنگ دنوں بلکہ ہفتوں چلے گی۔ اس کے ساتھ ہی کلکتہ فتح کرنے کا بھی ذکر ہوتا ہے۔ سترہ میل پیش قدمی کرکے آسام کو ہندوستان سے کاٹنے کا بھی ذکر ہوتا تھا۔ مگر آج سب دانتوں میں انگلیاں دے رہے ہیں۔ کہ یہ سب کیسے ہو گیا۔ یہ تو سب کچھ ریت کے گھروندے کی طرح گر گیا۔ نہ تو فوجیں طریقے سے پیچھے ہٹیں۔ نہ دوسری ڈیفنس لائن کی نوبت آئی۔ اور ڈھاکہ کی جنگ بھی ایسے لڑی جا رہی ہے۔ جیسے آسمان میں جہنّم کے پیندے میں سوراخ ہو گیا ہو۔ اس لیے اب ساری امیدیں کشمیر میں چھمب کے محاذ اور سیکورٹی کونسل میں جنگ بندی کے ریزدلیوشن سے وابستہ ہیں۔ دُنیا بھر کے ریڈیو بتا رہے ہیں کہ پاکستان نے چھمب کے علاقے میں بڑے زور کا حملہ کیا ہوا

ہے۔ سب لوگ دُعائیں مانگ رہے ہیں کہ ادھر کچھ ہو جائے۔
باہر بم برس رہے ہیں۔ اندر گریۂ سحری اور آہ نیم شبی کے
سے جذب کے ساتھ دُعائیں مانگی جا رہی ہیں۔ اور طبیعتیں بیچین ہیں۔
بعض پھرے پرانے فوجیوں سے ڈھاکہ پر بمباری کے نتائج کے
متعلق سوال کر رہے ہیں۔ جواب یہی ملتا کہ بم باری بذات خود کوئی
چیز نہیں۔ اگر لڑنے کی ہمت ہو تو یہ معمولی چیز ہے۔ اور اگر ہمت
جواب دے رہی ہو تو یہ حوصلہ شکنی کی آخری شکل بن جاتی ہے۔
۱۹۴۲ء میں انگلستان پر ہفتوں بمباری ہوئی۔ اور اتنی ہوتی تھی
کہ دن کو سورج دھوئیں اور دھول میں چھپ جاتا تھا۔ مگر لوگوں
کی ہمت نہ ڈولی اور وہ لڑتے رہے۔

"شہر کی لڑائی میں کیا صورت ہو سکتی ہے؟"

جواب ملتا ہے کہ یہ کھلا ہمت کی بات ہے۔ پیرس
جیسے بڑے شہر میں لوگ لڑے بغیر ہتھیار ڈال دیتے ہیں کہ شہر
خراب نہ ہو۔ اور سٹالن گراڈ جیسی جگہ میں ہمت کے بل بوتے
پر گلی کوچوں میں لڑائی کرکے دشمن کو شکست دی جاتی ہے۔
ہمت کی بات آتی ہے تو دل کو سکون پہنچتا ہے کہ خدا
کے فضل سے اس چیز کی ہم میں کمی نہیں۔ میرے ذہن میں

۱۹۶۵ء کی ہند و پاک جنگ کے معجزہ نما کارنامے گھومنے لگتے ہیں۔ جو ہمارے جیالے فوجیوں کی ہمّت اور جذبے نے سرانجام دیے۔ انشاء اللہ اب بھی ایسا ہی ہو گا۔ یہ ایک چیز ہے۔ جو ہمیں کسی سے مانگنے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ فوج کے اندر شراروں کی طرح پیدا ہوتی ہے۔ اور مَیں خدُا پر بھروسہ کر کے قدرے مطمئن ہو کر گھومنے لگتا ہوں۔ مگر ساتھ ساتھ سیانوں کے وُہ تبصرے بھی کانوں میں گونجتے ہیں کہ جب فوج غیر فوجی قسم کے سیاسی کاموں کی عادی ہو جائے تو وُہ بدل سکتی ہے۔

ہوٹل کے کمروں میں جو ریڈیو لگے ہیں اُن پر سے انڈیا اور پاکستان کنٹرول روم سے ہی کاٹ دیئے گئے ہیں۔ کیونکہ یہ غیر جانبدار علاقہ ہے۔ ہم صرف بی بی سی اور آسٹریلیا سُن سکتے ہیں۔ مگر لوگ اپنے ذاتی ریڈیو سے سُن رہے ہیں۔ اور ہندوستانی اناؤنسر لڑکی بڑی ڈانٹتی ہُوئی تیز آواز میں وُہ پیغام بار بار دُہرا رہی ہے۔ جو پچھلے کئی دِنوں سے انڈیا ریڈیو دے رہا ہے۔ یہ دراصل تین پیغامات ہیں۔ دو تو جنرل مانک شا کی طرف سے جنرل فرمان کی طرف ہیں۔ اور تیسرا جنرل مانک شا کی طرف سے پاک فوج کی طرف ہے۔ اس میں بار بار کہا جاتا ہے کہ ہتھیار ڈال دو۔

تو تمہاری جان بخشی ہو گی ۔ ورنہ تباہ کر دیئے جاؤ گے ۔

پہلی قسم کے چہرے گفتگو میں اکثر ان پیغامات کا حوالہ دیتے ہیں۔

دُوسری قسم کے چہرے اُنہیں سُن کر ہنس دیتے ہیں۔ یا گالیاں دیتے ہیں۔ مگر تیسری اور چوتھی قسم کے چہرے ان کو سُن کر دہل رہے ہیں۔

پندرہ دسمبر کا دن بڑا ہی اذیت ناک دن ہے۔ گھڑی کی سوئیاں مدھم ہیں۔ دُشمن کے جہاز تیز ہیں۔ بموں کے دھماکے پُرشور ہیں۔ سیکورٹی کونسل سُست ہے۔ امریکہ کا ساتواں بحری بیڑہ آنے کے اعلان کے باوجود نہ تو پہنچ پاتا ہے۔ اور نہ یہ بتاتا ہے کہ کیوں آ رہا ہے۔ شمال میں چینی فوجیں حرکت کر رہی ہیں۔ اور چین مدد کا اعلان بھی کرتا ہے۔ مگر کچھ نہیں ہوتا۔ مغربی پاکستان میں چھمب کا حملہ ناکام ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ راجستھان میں ہندوستانی فوجیں آگے بڑھ رہی ہیں۔ کراچی پر دھڑا دھڑ حملے ہو رہے ہیں۔ یہ سب مل کر ایسی بھیانک تصویر پیش کرتے ہیں۔ جسے دِل اور دماغ ماننے کو تیار نہیں۔ اپنے ہی اجزائے پریشان کا تصوّر کون کر سکتا ہے۔

باہر ویران شہر پہ ویران تر شام اُترنے لگتی ہے۔ اندر

ریڈیو سے چپکے ہُوئے چہروں کی ویرانیاں بڑھنے لگتی ہیں۔ چھمب میں کچھ نہیں ہُوا۔ سیکورٹی کونسل میں کچھ نہیں ہُوا۔ مگر ڈھاکہ میں تو بہت کچھ ہو گیا ہے۔ اس وقت ہوائی حملے بند ہیں۔ مگر ان کی فلک شگاف بازگشت چہروں کے پیچھے لرزاں ہے۔ اور تازہ ترین خبر جنرل مانک شا۔ کا الٹی میٹم ہے۔ کہ کل صبح ساڑھے نو بجے تک کی مہلت ہے۔ اس وقت تک ہتھیار ڈال دیئے جائیں ورنہ ساڑھے نو بجے ہمارے جہاز ڈھاکہ کی ہر اُس بلڈنگ کو تباہ کر دیں گے جس میں پاک فوج ہو گی۔ آج دن بھر کے واقعات دیکھنے کے بعد لوگ جانتے ہیں۔ کہ یہ خالی دھمکی نہیں ہے۔ شہر میں کرفیو کے باوجُود دشمن کو منٹ منٹ کی خبر ملتی رہی تھی۔ کہ پاک فوج اِدھر سے ادھر گئی ہے اور گرجتے برستے ہوائی جہاز فوراً ہی بجلیاں گرانے آن موجُود ہوتے۔ کل بھی یہی ہو گا۔ کیونکہ سراج الدولہ کی اس سرزمین میں میر جعفر آج پھر حاوی ہُوا ہے۔ اور اُس کی اُمت گلی کوچوں سے ہندوستانی فوج کی رہنمائی کر رہی ہے۔

مگر اس کے ساتھ ہی جنرل نیازی کا اعلان بھی گھوم رہا ہے کہ ہم لڑیں گے اور لڑتے جائیں گے .... اور

مجھے دُشمن کی فتنہ سامانیوں اور شکست کی ذلت کے باوجود اس میں کچھ وقار نظر آتا ہے......... قومی غیرت کے مہین تار سے بندھا ہُوا........ یہ ٹوٹتے تارے کا شرار ہی سہی - مگر اس میں ٹوٹتے وقت اپنے جوہر کو نمایاں کرنے کی شان تو ہے نا.........

ہم لوگ جب کل یہاں پہنچے تو ریڈ کراس نے ہمیں رجسٹریشن کارڈ دیئے - جنہیں لے کر ہم کھانے کے کمرے میں جاتے ہیں. کل دوپہر - پھر رات - صبح کا ناشتہ - پھر دوپہر کا کھانا - اور اب پندرہ دسمبر کی رات کا کھانا - گویا پانچویں دفعہ کیفے ارم میں جمع ہو رہے ہیں - اس عرصہ سبھی چہرے نظروں سے گزر گئے ہیں - کوئی ایک دفعہ - کوئی دو دفعہ - کوئی تین یا اس سے بھی زیادہ دفعہ - مختلف اقسام سے قطع نظر بعض چہرے ایسے ہیں جو کسی نہ کسی وجہ سے ذہن میں اٹک گئے ہیں -

ایک سابق وزیر کا چہرہ جو بالکل بے جان سی لگتا ہے. سانولے رنگ پر پیلاہٹ چھا گئی ہے - وہ مسکرانا جیسے جانتا ہی نہیں - دو دن پہلے وہ وزیر تھا - دو دن بعد فقیر بھی نہ ہو گا - کیونکہ یہاں فقیر کو تو امان مل جائے گی - مگر اِسے نہیں

ملے گی۔ مجھے کل سے کئی دفعہ خیال ہُوا کہ اسے کسی لمحے دل کا دَورہ پڑے گا مگر وہ آخر وقت تک تھکے ہوُئے قدموں سے اپنے بے جان جسم کو گھسیٹتا ہوُا کھانے کے کمرے میں آتا ہے۔ جو سامنے آ جائے اُسے سلام کر دیتا ہے یا لے لیتا ہے۔ سَر جھکائے کھانا کھاتا ہے۔ اور پھر اسی طرح واپس چلا جاتا ہے۔

ایک اور جوڑا ہے مگر ان میں نمایاں چہرہ خاتون کا ہے۔ جو یہاں کی اونچی سوسائٹی میں روح رواں تھی۔ وُہ ہمیشہ سفید ساڑھی پہنے آتی ہے۔ اور اپنے چہرے سے بڑی کالے شیشوں والی عینک کے پیچھے ہوتی ہے۔ تشویش اور فکر بجا۔ مگر شگفتگی کا اپنا مقام ہے اور وُہ یہ مقام خوُب پہچانتی ہے۔ یہ چہرہ ڈائننگ ہال میں داخل ہونے کے بعد کبھی سیدھا میز پر نہیں جاتا۔ بلکہ سرِ راہ ایک سے بات، دُوسرے سے حال احوال، تیسرے کی خیریت، چوتھے سے ہمدردی، میز سے بھی اِدھر اُدھر سلام پھینکے جاتے ہیں۔ مدح خوانوں میں غیر ملکی بھی شامل ہیں۔ بنگالی بھی اور غیر بنگالی بھی۔ مشرقی پاکستان میں ان کا بزنس ہے۔ جان کا خوف ہوٹل میں لے آیا ہے۔ بزنس کا خوف محتاط بنائے ہوُئے ہے۔ اسی وجہ سے سیاسی بات

بالکل نہیں کرتیں۔ کیونکہ

کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

ایک چہرہ غیر ملکی ہے۔ مگر ریڈکراس کا رکن۔ انتہائی خلیق اور ہمدرد۔ جب بھی کھانے کے کمرے میں آتا ہے۔ ہر شخص کی ہر انداز میں تسلّی کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ شکست خوردہ قوم کی شکست کو اُن کے مُنہ پر نہیں مارتا۔ جیسے باقی غیر ملکی اپنی شریر چتوّن، مغرور خاموشی اور احساسِ برتری سے جھلکتی ہوئی لاتعلقی سے کرتے ہیں۔ اس کے اُونچے لانبے قد اور متین و سنجیدہ چہرے سے ہمدردی کی شعاعیں پھوٹتی ہیں۔

ایک اور چہرہ جو ادھیڑ عمر خاتون کا ہے۔ اپنے ساتھ تین چار پیارے سے بچّوں کو لئے آتا ہے۔ ہال میں بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک دو کو سلیقے سے سلام کرتا ہے۔ اور پھر بچّوں کے کھانے پر پوُری توجہ دیتا ہے۔ مجھے اس چہرے سے باتوں کا اتفاق ہوتا ہے۔ تو پتہ چلتا ہے کہ استقلال کی چٹان ہے۔ اِس کے عزیز مشرقی پاکستان اورمغربی پاکستان میں یکساں طور پر پھیلے ہوئے ہیں۔ کوئی کاروبار میں۔ کوئی فوج میں اور کوئی سرکاری ملازمت میں۔ خود اپنی جڑیں بنگال میں

ہیں کیونکہ اُردو دان بنگالن ہے۔ مگر نہ اپنی جان کا خوف، نہ
بچّوں کے لیے غیر ضروری تشویش۔ نہ اپنے عزیزوں کا فکر۔
ایک بچہ اُوپر کمرے میں بیمار پڑا ہے۔ جس کو دیکھنے کے لیے
خاوند اوپر کمرے میں رُک گیا ہے۔ مگر یہ چہرہ ہر چیز کو خدُا
کی مصلحت جان کر خندہ پیشانی سے برداشت کر رہا ہے۔
موت کے خطرے نے تقریباً سب کے اندرُونی تار ڈھیلے کر
دیئے ہیں۔ مگر اس کا روّیہ ہے۔ ؎

جان دی، دی ہُوئی اُسی کی تھی۔
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہُوا

ایسے چہروں کو دیکھ کر بڑی تقویّت ہوتی ہے۔

پھر ایک سانولی سلونی بوٹے سے قد کی بیس سالہ لڑکی
کا چہرہ ہے۔ جو چند اور چہروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ چہرے
اس کی بہنوں، والدہ، والد اور چھوٹے بھائیوں کے ہیں۔
یہ چہرہ بنگالی ہے مگر غیر بنگالی نقوش لیے ہُوئے۔ خوبصُورت،
شائستہ اور ذہین چہرہ۔ کسی وقت سہما ہُوا۔ کسی وقت مایوس،
کسی وقت پُر تشکن۔ مگر ہر حالت میں دلکش۔ چھ سات چہروں
کا یہ گروپ اس سارے ہجوم میں سات ستاروں کے گروپ

دُبِّ اکبر کی طرح ہے۔ جس میں سب سے روشن چہرہ اسی لڑکی کا ہے۔

ایک چہرہ ہوٹل کے ایک سٹاف ممبر کا ہے۔ جو بنگالی ہے اور جانتا ہے کہ بنگلہ دیش کا قیام اب کوئی گھنٹوں کی بات ہے۔ اور یہ جتنے لوگ بیٹھے ہیں ان میں اکثریت عدو کی ہے مگر پھر بھی وُہ مؤدب اور سبک خرام ہے۔ تعظیم اور خندہ پیشانی سے ہر ایک کے آرڈر کی تعمیل کراتا ہے۔ اور بھاگ بھاگ کر دیکھ رہا ہے کہ کسی کو کوئی شکایت تو نہیں۔ تساہل پر مُسکرا کر معذرت کرتا ہے۔ اور شکریہ سُن کر کھل جاتا ہے۔

پندرہ دسمبر کی شام کو مَیں کھانا کھانے کے لیے کمرے سے نِکل کر آتا ہوں۔ تو چند منٹ لفٹ کے انتظار میں کھڑا ہونا پڑتا ہے۔ جہاں چند پھرے کُھرتے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ پھر لفٹ میں بھی سرگوشیاں سُنتا ہوں۔ کیفے ارم کو جاتے ہوُئے سرِراہ باتیں اچک لیتا ہوں۔ میز کی تلاش میں اِدھر اُدھر گھومتے ہوُئے کچھ بھنک کان میں پڑتی ہے۔ ہر جگہ ایک ہی ذکر ہے۔ کہ ہمیں ہتھیار ڈال دینے چاہئیں۔ کیونکہ اس

طرح مقابلہ ناممکن ہے۔ ہوائی بمباری اپنا اثر کر گئی ہے۔ لوگوں کی ہمت جواب دے گئی ہے۔ ان کے اعصاب کچے کوئلوں کی آگ کی طرح چٹخ رہے ہیں۔ یہ فوجی صورتِ حال سے بے خبر ہیں۔ اپنی ذات کے تحفّظ کے بھنور میں گھرے ہوئے ہیں۔ نہ جانے صحیح فیصلہ کیا ہے۔ یہ تو پورے حالات جاننے پر ہی ہو سکتا ہے۔

کوئی کہہ رہا ہے آج ہمارے نمائندے مسٹر بھٹو نے سیکورٹی کونسل کو کھری کھری سنائی ہیں۔ اور کہا ہے کہ میرا ملک ختم ہو رہا ہے اور آپ بیٹھ کر باتیں بنا رہے ہیں۔ اور پھر واک آؤٹ کر گئے ہیں۔

"اس کا کچھ اثر تو ضرور ہو گا" ایک چہرہ دمک کر پوچھتا ہے۔

میں پاس سے گزرتے ہوئے سوچتا ہوں۔ کہ کیا اثر ہو گا۔ دوسری جنگِ عظیم سے پہلے شاہ ہیل سلاسی نے اپنے دونوں ہاتھ اُٹھا کر لیگ آف نیشنز کے سامنے یہی الفاظ کہے تھے مگر کیا اثر ہوا تھا۔ اٹلی من مانی کرتا رہا۔ جو قومیں اپنے من میں ڈوب کر سُراغِ زندگی پانے کی کوشش نہیں کرتیں۔ اُن

کے لیے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکائتیں، نہ شکائتیں۔

جس قوم کے دامن میں صرف مشتِ خاکِ جگر ہے اور ہاتھوں میں خونِ حسرتِ مے ہے۔ اس کے تقاضوں کا حشر قوموں کے کوچے میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے کہ ؎

مَیں نے کہا کہ بزمِ ناز چاہیئے غیر سے تہی
سُن کے ستم ظریف نے مجھ کو اٹھا دیا کہ یوں

غالباً دِل میں سبھی یہی محسوس کر رہے ہیں اسی وجہ سے کھانے کے کمرے کا ماحول انتہائی سوگوار ہے۔ ہوٹل کے سیٹورڈ پتھر کے بتوں کے سامنے کھانا رکھ رہے ہیں۔ جو بغیر بولے مشینی انداز میں منہ ہلا رہے ہیں۔ ذہنی تناؤ کی کمان پُوری طرح کھچ چکی ہے۔ اور مَیں سوچ رہا ہوں کہ مغربی پاکستان میں لوگوں کو اندازہ بھی نہیں کہ یہاں کیا ہو رہا ہے۔ مَیں اپنے ساتھ والے چہرے سے سرگوشی کرتا ہوں تو وُہ آہ بھر کر کہتا ہے۔

"افسوس تو یہ ہے کہ مغربی پاکستان میں لوگوں کو پچھلے کتنے ہی عرصہ سے اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کیا ہو رہا ہے.....
اب انہیں کیا اندازہ ہو گا۔"

ساتھ بیٹھا ہُوا ایک بنگالی چہرہ اثبات میں ہل جاتا ہے۔

پہلی قسم کے غیر ملکی چہرے ایک دو میزوں پر مکھیوں کے گچھے کی طرح اکٹھے بیٹھے ہیں۔ اور چپکے چپکے باتیں کر رہے ہیں۔ ایک اور غیر ملکی فوٹو گرافر دُور ایک میز کی طرف جا رہا ہے۔ ادھر سے ایک چہرہ ہاتھ اُٹھائے آواز دیتا ہے۔

"ہیڈ اے گڈ ڈے؟" (HAD A GOOD DAY?)

وُہ بھی ہاتھ اُٹھا کر آنکھ مارتا ہے: "ونڈر فل"

یہ لوگ غالباً بمباری کی فلموں کی بات کر رہے ہیں۔ ان کو یقیناً اتنے غیر معمولی انداز میں اصلی جنگ فلمانے کا موقع نہیں ملا ہو گا۔ جہاں طرفین میں سے ایک کے ہوائی جہاز اس طرح بمباری کر رہے ہیں۔ جیسے اپنے ملک کے میدان میں پریکٹس کر رہے ہیں۔

ڈبّہ اکبر والے روشن چہرے اپنے باپ کے جلو میں آتے ہیں۔ اور چپکے سے کھانا کھانے لگتے ہیں۔ سانولی سلونی لڑکی بھی ساتھ ہے۔

ہال میں خاموشی ہے۔ سوائے اس کے کہ کبھی سرگوشیوں کی بھنبھناہٹ بلند ہو جاتی ہے۔ یا کوئی بچّہ بول اُٹھتا ہے۔ یا

کوئی چہرہ کسی سٹیورڈ کو بلاتا ہے۔

کھانا کھا کر میں اپنے کمرے میں بیٹھا ہوں۔ اتنے میں تین چار اور اصحاب آ جاتے ہیں۔ اور اگلے دن کے متعلق قیاس آرائیاں ہونے لگتی ہیں۔ بعض لوگوں کو اب بھی جنگ بندی کی اُمید ہے۔ اگر وہ ہو جائے تو موجودہ حالات میں یقیناً بہترین چیز ہے مگر خطرہ دُوسری بات کا ہے۔ کہ ہتھیار نہ ڈالنے پڑیں۔

ایک چہرہ ایک پیشین گوئی کا ذکر شروع کر دیتا ہے جو اس نے سال بھر پہلے آسٹریلیا میں پڑھی تھی۔ جس میں یہ تھا کہ ۱۹۷۱ء کا سال پاکستان کے لیے تباہ کن ثابت ہو گا۔ مشرقی پاکستان میں بہت خون بہے گا اور پاکستان کے قریباً قریباً دو ٹکڑے ہو جائیں گے۔ مگر پھر حالات ڈرامائی انداز میں بدلیں گے اور سال کے خاتمے تک سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا۔ اور پھر پاکستان اپنے اتحاد کو قائم رکھتے ہوئے ایک خوشحال مُلک ہو گا۔

چند اور چہرے بھی میرے کمرے میں جھانکتے ہیں۔ اور یہ باتیں سُنتے ہیں۔ سب لوگ سروں کو کھجا کر سوچتے ہیں۔ بحث کرتے ہیں۔ مگر اُمید کی کوئی کرن ایسی نظر نہیں آتی جو اب ڈرامائی انداز میں حالات کو سنبھال سکے۔ اگر کل نو بجے تک

جنرل مانک شا کا الٹی میٹم نامنظور کر دیا جانا ہے۔ تو بھی ڈھاکہ کی جنگ سات آٹھ روز سے زیادہ نہیں چل سکتی۔ اگر چھمب میں حملہ کامیاب ہو گیا ہوتا تو بھی کوئی بات تھی۔ مگر اب تو وُہ بھی ناکام ہو چکا ہے۔ اور بڑی طاقتوں کی شعبدہ بازی بے نقاب ہو چکی ہے۔ پاکستان کے ٹکڑے کرنے کی سازش یقیناً ان کی ہو گی۔ مگر اس آگ کے لگانے میں سب سے اہم کردار ہمارے گھر کے چراغوں نے کیا ہے۔ غیروں نے تو فقط ہماری پیدا کردہ صُورتِ حال سے فائدہ اُٹھایا ہے۔ اور اَب دُور کھڑے اس دَردناک اپریشن کو دیکھ رہے ہیں۔ جس میں ایک حِصّہ کاٹا جا رہا ہے۔

اس پیشین گوئی کو سنانے والا بالآخر خود بھی دُوسروں کے ساتھ شریک ہو کر کندھے اچکاتا ہے۔ اور مایوسی سے سر ہلاتا ہے۔ یہ دُرست ہے کہ ڈوبنے والا تنکے کا سہارا ڈھونڈتا ہے۔ مگر وُہ تنکا ہونا چاہیئے تنکے کی اُمید نہیں۔ خالی اُمیدیں تو کچھ نہیں کر سکتیں۔ ؎

وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

رات کافی جا چکی ہے۔ باہر بلیک آؤٹ ہے۔ اندر

ایک چھوٹی سی موم بتی ٹمٹا رہی ہے۔ جس کے گرد کتابیں کھڑی کرکے اُس کی روشنی کو قید کرنے کی کوشش کی گئی ہے ——

مَیں موم بتی بجھاتا ہوں تو اندھیرا چاروں طرف سے مجھے دبوچ لیتا ہے —— اتنا تاریک اندھیرا مَیں نے آج تک نہیں دیکھا۔ کیونکہ شہر میں بلیک آوٹ کا اندھیرا۔ کمرے میں تاریکی کا اندھیرا اور میرے اندر مایوسیوں کا اندھیرا ہے۔ کہیں بھی روشنی کی کرن نظر نہیں آتی۔ نہ تن کے باہر۔ نہ من کے اندر، اس تاریکی میں بال برابر وسوسے بھی دیو قیامت بن کر مجھے ہیبت دِلا رہے ہیں۔ اور یہ ظلمت لامحدود اور اتھاہ بن گئی ہے۔

اچانک فون کی گھنٹی صورِ اسرائیل کی طرح اندھیرے کے پرخچے اڑانے لگتی ہے۔

مَیں ہڑبڑا کر اِدھر اُدھر ہاتھ مارتا ہوں۔ ایک دفعہ فون پر ہاتھ لگتا ہے۔ تو ریسیور نیچے گر جاتا ہے۔ ٹارچ جلا کر فون اُٹھاتا ہوں۔

گھبرائی ہُوئی آواز کہتی ہے" ذرا اپنے کمرے کی کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر باہر دیکھو اور پھر مجھے بتاوٗ یہ کیا ہے"۔ میرا ایک ساتھی ساتھ والے کمرے سے فون کر رہا ہے۔

مَیں باہر جھانکتا ہوں تو ششدر رہ جاتا ہوں۔ اس اندھیرے میں شراروں کا ناچ ؟ اور وُہ بھی اتنے بڑے پیمانے پر!!

چند ثانیے میرا ذہن ماننے سے انکار کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تفصیلات میرے اندر جذب ہونے لگتی ہیں۔

ریس کورس کی وسیع گولائی اندھیرے میں گُم ہے۔ مگر اس کے محیط پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد شرارے چمکتے ہیں۔ اور پھر بُجھ جاتے ہیں۔ شمال۔ جنوب۔ مشرق۔ مغرب ہر طرف شرارے پلکیں جھپک رہے ہیں اور وُہ بھی اس ترتیب سے کہ ریس کورس کی حدُود کا پُورا تعیّن ہو جاتا ہے۔

مَیں قیاس کرتا ہوں کہ کیا ہو سکتا ہے مگر قیاس بتائے بغیر ساتھی سے فون پر بات کرتا ہوں۔

"یہ بجلی کے کھمبوں کی خرابی تو نہیں ہے؟"

"تمہارا مطلب شارٹ سرکٹ سے ہے۔"

"ہاں۔"

"نہیں، بلیک آؤٹ میں پیچھے سے بجلی بند کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر کیا ہے؟"

"میرے خیال میں......" وُہ رُکتا ہے۔ مَیں محسوس کرتا

ہوں کہ وُہ بھی وہی اندازہ لگا رہا ہے۔ جو میرے ذہن میں ہے۔ مگر میری طرح وُہ بھی اُس کے واضح حوالے کا سامنا کرتے ہوئے گھبرا رہا ہے۔

بالآخر ہم دونوں آہستہ آہستہ اپنے من کی بات انڈیل دیتے ہیں۔ دونوں متفق ہیں کہ شاید اس مقام پر آج رات کسی وقت پیراشوٹ اتارے جائیں گے۔ اور نیچے سے ہندوستان کے مددگار بنگالی اُن کی رہبری کرنے کے لیے شرارے پیدا کر رہے ہیں۔

رات کے دو بج رہے ہیں۔ مَیں سونے کی ناکام کوشش کر رہا ہوں۔ ڈھاکہ میں پچھلے سات مہینے کے قیام کے دوران مَیں نے ایسی بے کل راتیں پہلے بھی کاٹی ہیں۔ مگر اس وقت بے کل اندیشہ ہائے دُور دراز کی تھی۔ اور اب یہ اندیشے زندہ حقیقتیں [illegible] ہیں۔ اور مَیں محسوس کرتا ہوں کہ جب زمانہ کروٹ بدل رہا ہو تو افراد کی کروٹیں بے معنی ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود بے چینی ہے کہ رات کٹ جائے اور صُبح پتہ چلے کہ اب کیا ہونے والا ہے۔ پھر خیال آتا ہے۔ ؎

رات کٹنے کے منتظر ہو عدم   رات کٹ بھی گئی تو کیا ہو گا

مجھے نہیں معلوم کہ مَیں کب سویا۔ مگر رات کٹ گئی۔

مَیں صُبح ناشتہ کرنے جاتا ہوں تو میرے کارڈ پر سولہ دسمبر کی تاریخ درج کر دی جاتی ہے۔ اور مَیں سوچتا ہوں کہ ۲۲ نومبر کے بعد آج مشرقی پاکستان پر حملہ ہُوئے پچیس دن گزر گئے ہیں۔ اور دشمن ڈھاکہ پہنچنے کو ہے۔ میرا مضطرب دِل پوچھتا ہے کہ ہم لڑنے میں اتنے بُرے تو نہ تھے۔ مگر مَیں دِل کو سمجھاتا ہوں۔ کہ لڑنے کی قابلیت کا پتہ فقط لڑائی کے وقت پتہ چلتا ہے۔ اور جب قوم خاردار جھاڑیوں میں سے رینگ کر گزری ہو۔ تو حال کی کیفیت بُنیادی چیز ہوتی ہے۔ ماضی کے سرٹیفکیٹ کچھ نہیں کر سکتے۔

مَیں جس میز پر جا کر بیٹھتا ہوں۔ اِس کے قریب والی میز پر خوبصُورت لڑکی اور روشن چہروں والا گروپ بھی موجُود ہے۔

واپسی پر لفٹ کے پاس نوٹس لگا ہے کہ اُوپر والی منزل میں نہ ٹھہریئے۔ کیونکہ آج ہوٹل پر بمباری کا خطرہ ہے۔ نوٹس کے پاس ہی چند چہرے آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ کہ کسی نے دُشمن کو غلط اطلاع دے دی ہے کہ غیر جانبدار علاقے کی

چھت پر طیارہ شکن توپ نصب کر دی گئی ہے۔ اس لیے آج یہاں بمباری کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے۔ مَیں گیارہ منزل اوپر اپنے کمرے میں جاتا ہوں۔ تو ہوائی حملے کا سائرن ہوتا ہے۔...... میری گھڑی ساڑھے نو بجا رہی ہے۔ .... اس کا مطلب ہے پاکستان الٹی میٹم کو رد کرکے لڑنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ...... میرے جسم میں جان آنے لگتی ہے۔

کمرے سے نوٹ بُک، قلم اور کیمرہ اُٹھا کر لفٹ کی طرف آ جاتا ہوں۔

لفٹ میں ایک میاں بیوی اور تین بچے بھی ہیں۔ جن کا ڈھیروں سامان ساتھ ہے۔ یہ بھی گیارہویں منزل سے نیچے جا رہے ہیں۔ عورت کی آنکھیں چھلکنے ہی والی ہیں۔ وُہ تڑپ کر شکایت کرتی ہے۔

"اس بھاگ دَوڑ سے تو یہی بہتر ہے کہ ابھی بم پڑے اور مَیں مر جاؤں۔ .... اتنے بچّوں کے ساتھ یہ مصیبت۔ کتنے دن سے ہم بے گھر ہُوئے ہیں۔"

خاوند اُسے بھرپُور نظر سے دیکھتا ہے۔ ...... یہ بہت ہی عجیب نظر ہے۔ اس میں غصّہ بھی ہے۔ فہمائش بھی، ہمدردی

بھی۔ بے بسی اور بیچارگی بھی۔ ان سب کے ساتھ ساتھ ضبط بھی ہے۔ اور "میں کیا کروں" کا اعتراف بھی۔

دسویں منزل آ گئی اور میں لفٹ سے باہر آ گیا ہوں۔

اپنے ایک ساتھی کے کمرہ نمبر ۱۰۲۶ میں چلا جاتا ہوں۔

چند لمحے کیمرہ اُٹھائے کھڑکی میں کھڑے ہو کر ہوائی جہازوں کا انتظار کرتا ہوں۔ مگر وُہ نہیں آتے تو صوفے پر بیٹھ کر یہ سطور ("چہرے") لکھنے لگ جاتا ہوں۔........ لکھتے لکھتے وقت کا اندازہ نہیں رہتا۔

دروازے پر دستک ......

میں اُٹھ کر دروازہ کھولتا ہوں۔ تو میرا ساتھی کہتا ہے۔

"چلیے سب لوگوں کو نیچے چنبیلی روم میں اکٹھا ہونے کو کہا گیا ہے۔"

"کیوں ؟" میں حیرت سے پوچھتا ہوں۔

"سرنڈر (SURRENDER)" وُہ صرف ایک لفظ بولتا ہے۔

مجھے سمجھ نہیں آتا کہ کیا کروں ...... اضطراری طور پہ گھڑی دیکھتا ہوں۔

دس بج کر بیس منٹ .... اور ساتھ سولہ تاریخ

ہے - جمعرات۔

چنبیلی روم میں ڈیڑھ سو کے قریب کرسیاں پڑی ہیں۔ جن میں سے پچاس پچپن پر لوگ بیٹھے ہیں۔ سامنے چھوٹے سے سٹیج پر ایک میز اور تین کرسیاں سجی ہیں۔ مگر اجلاس کا انعقاد کرنے والے ابھی نہیں آئے۔ اکا دکا لوگ اندر آ رہے ہیں۔ اور کرسیاں بھرتی جاتی ہیں۔ مگر لوگ گم سم ہیں۔ شاید کوئی ایک آدھ چہرہ اپنے ساتھ والے سے سرگوشی کرتا ہو۔ ورنہ سب خاموشی ہے۔ پونے گیارہ بجے ریڈکراس والا مشفق چہرہ آ کر سٹیج پر بیٹھتا ہے۔ ساتھ دو کارکن اور بھی ہیں۔

وہ رک رک کر محتاط الفاظ میں بات شروع کرتا ہے۔ اس کی فطری نیکی یہاں بھی نظر آ رہی ہے۔ کہ وہ سوچ سوچ کر الفاظ چنتا ہے۔ تاکہ ہماری دلآزاری نہ ہو۔ اور نرم ترین الفاظ میں ہمیں اس بھیانک ترین حقیقت سے آگاہ کرے۔

وہ بتاتا ہے کہ یہاں کے فوجی کمانڈروں نے ہتھیار ڈالنے کے متعلق جنرل مانک شا کا الٹی میٹم منظور کر لیا تھا۔ مگر ان سے ٹیلیفون پر رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ تب انہوں نے ریڈکراس سے بات کی۔ اور ہم نے امریکن سفارت خانے کی وساطت

سے نئی دہلی کو اطلاع دی۔ وہاں سے انڈین گورنمنٹ نے اپنے کمانڈروں کو بتایا۔ اس وقت جہاز حملے کے لیے اُڑ چکے تھے۔ جو واپس بلوا لیے گئے۔...... اب قصہ ختم ہو چکا ہے۔

میرے اردگرد سب چہرے فق ہیں۔

اب ہم بنگلہ دیش میں بیٹھے ہیں۔...... خدا معلوم آزاد بنگلہ دیش یا ہندوستان کا ایک صُوبہ۔

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وُہ برسی ہے اَب کے برکھا

ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں

کمرے کی کشادگی پھیل کر ایک وسیع خلاء بن گئی ہے۔ جس میں ہم معلّق ہیں —— ہماری حسّیات مفلوج ہیں۔ پاؤں تلے زمین محسوس نہیں ہوتی۔ سر پر چھت نظر نہیں آتی۔ دیواریں کہیں غائب ہو گئی ہیں —— میں کُرسی پر بیٹھا ہوں۔ اُس کا لمس عجیب سا محسوس ہوتا ہے۔ جیسے کوئی غیر حقیقی چیز ہو۔ جس کا کوئی وجُود نہیں۔ مگر پھر بھی جسم کو چھُو رہی ہے —— سارے خلا میں عجیب قسم کا خواب سا عالم ہے۔ جس میں کئی کیفیتیں ہیں۔ مگر پھر بھی نہیں ہیں۔ سائے خلط ملط ہیں۔ سکڑتا۔ پھیلتا۔ بکھرتا گہرا ہے۔ اس بے پایاں گہرے کی دُھندلی کھوکھ سے "انہونی" جنم

لیتے لیتے "ہو" جاتی ہے —— دُور —— بہت دُور ——
یقین اور بے یقینی کے ہیولے آپس میں گتھم گتھا ہیں۔

پھر ہمیں ہدایات دی جاتی ہیں۔ جن کے تحت اب یہاں رہنا ہو گا۔ اور آخر میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ غیر جانبدار علاقے کا مطلب یہ نہیں کہ یہاں سیاسی پناہ مل سکے۔ بلکہ صرف اتنا ہے کہ یہاں حتی الامکان جنگ نہیں ہو گی۔ اس لیے اس ملک کی قانونی حکومت اگر کسی شخص کو مانگتی ہے۔ تو ریڈ کراس کو اس کی تعمیل کرنا ہو گی۔

ہدایات ختم ہوئیں تو بعض لوگ سوالات کر رہے ہیں۔ جن کے جواب دیئے جا رہے ہیں میں بریف کیس کھول کر اپنی نوٹ بک نکالتا ہوں۔ اور اس میں "چہرے" کی آخری سطور لکھتا ہوں۔ پھر رپورتاژ ختم کرکے اپنا نام لکھتا ہوں۔ اور ساتھ انگریزی میں نوٹ لکھتا ہوں۔ کہ اگر یہ کاغذات کسی کو ملیں تو اُسے محمد طفیل مدیر "نقوش" ۱۱۔ ایبک روڈ لاہور کو بھجوا دے۔ یہ کارروائی اس لیے ضروری تھی کہ اس لمحے کے بعد ہمارا مستقبل انتہائی مخدوش ہے۔ اور میں کسی وقت بھی گرفتار کیا جا سکتا ہوں۔ یا ہجوم کے ہاتھوں میرے پُرزے اُڑ سکتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ یہ کاغذات ہوٹل

کے کمرے میں کسی غیر اہم میز کی ایسی دراز میں رکھ دُوں گا۔ جس پر نظر پڑنے کا امکان کم ہو۔ اگلے دو چار ماہ میں شاید کوئی مُسافر وہ دراز کھول لے[1]

[1] چودہ دسمبر کو جب ہم ہوٹل میں پہنچے۔ تو حالات اس تیزی سے بدل رہے تھے کہ میں اُنہیں لکھنے کے لیے بے چین تھا۔ لیکن اگر انہیں ڈائری کی شکل میں لکھا جاتا تو جلد یا بدیر وہ ڈائری ہندوستانیوں کے ہاتھ پڑ جاتی اور پھر وہ اصرار کرتے کہ اس سے پہلے کی لکھی ہُوئی ڈائری بھی اُنہیں دی جائے۔ اس خطرے کو ٹالنے کے لیے مَیں نے ڈائری کی شکل میں کچھ لکھنے کی بجائے ایک مضمون بعنوان "چہرے" لکھنا شروع کیا۔ جس میں لوگوں کے چہروں پر تاثرات کے ذکر کے پردے میں واقعات کا ریکارڈ تھا۔ اس مضمون میں ہر دو چار گھنٹے بعد اضافہ کرتا جاتا حتیٰ کہ ہتھیار ڈالنے کے اعلان کے ساتھ یہ مکمل ہو گیا۔ پہلے مَیں نے اُسے دراز میں رکھ دیا۔ مگر بعد میں حالات کا جائزہ لینے کے بعد ایک پاکستانی جرنلسٹ کو دے دیا۔ کیونکہ خیال تھا کہ وُہ لوگ فوراً رہا کر دیئے جائیں گے۔ اور مغربی پاکستان چلے جائیں گے۔ مگر یہ اُمید عبث ثابت ہوئی۔ اور جب تین روز بعد ہمیں ڈھاکہ چھاؤنی لے گئے تو وہاں ان صاحب سے ملاقات ہُوئی۔ مَیں نے مضمون کے متعلق دریافت کیا تو انہوں نے بتایا کہ وُہ تو گم ہو گیا ہے۔ چنانچہ مَیں دوبارہ لکھنے پر مجبُور ہو گیا۔ ایک ٹوٹے ہُوئے بنگلے کے انبار میں سے کچھ سادہ کاغذات مل گئے۔ جن پر یہ تحریر ۲۵ دسمبر کو شروع کی جو تین جنوری ۱۹۷۲ء کو ختم ہُوئی۔ اس تحریر میں زیادہ تفصیلات ہیں اور یہ اس مضمون سے دس گنا طویل ہے۔ دو سال کی قید کے بعد پاکستان آنے پر اس میں کچھ ترامیم اور اضافے کئے

ریڈکراس کی طرف سے اعلان ہو رہا ہے کہ دفتر میں تھوڑی دیر تک فارم آ جائیں گے جن پر اپنے گھر والوں کو خیریت کی اطلاع دی جا سکتی ہے۔

میٹنگ ختم ہو جاتی ہے۔ •

یوں لگتا ہے کہ سب کچھ ہی ختم ہو گیا ہے۔۔۔۔۔۔نہ جہان ہے نہ جان۔۔۔۔۔۔۔۔ نہ آس رہی نہ احساس۔۔۔۔ ۔۔پاکستانی جھنڈے کے چاند تارے یہاں کیا ڈوبے۔ کائنات کے مہ و انجم ہی ٹوٹ گئے۔۔۔۔۔۔۔۔ لوگ چنبیلی روم سے باہر نکل رہے ہیں میں بھی اس ریلے میں بہہ کر باہر آ گیا ہوں۔ کیمرہ ہاتھ میں لٹکا ہے مگر اسے استعمال کرنے کا ہوش نہیں رہا۔۔۔۔۔۔ذہن میں ایک دھواں سا گھوم رہا ہے۔ کہ صدر یحییٰ کا انتقال اقتدار کا وعدہ آج پُورا ہو گیا۔۔۔۔۔۔۔۔ اس دھوئیں میں سے دو بنگالی چہرے جھانکتے ہیں۔ ایک ستمبر والا اور دُوسرا نومبر والا۔ ۔۔۔۔۔۔۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی رینگ جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔ پھر قانون کی کتابوں کا بدنام فقرہ یاد آتا ہے کہ انسان جھوٹ بول سکتا ہے۔ مگر حالات کبھی جھُوٹ نہیں بولتے۔

اب وُہ بدترین وقت آ گیا ہے۔ جس کے خوف سے سب

چہرے لرزاں تھے۔ پاکستان کی حکومت ڈھاکہ میں ختم ہو چکی ہے۔ اب مکتی باہنی (بنگالی گوریلے) اور ہجوم کی حکومت ہے۔ یہ دونوں ان تمام لوگوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ جو اس ہوٹل میں پناہ گزین ہیں۔ گورنر۔ وزراء۔ مغربی پاکستان کے سرکاری ملازمین۔ اور غیر سرکاری لوگ۔ اور وُہ بنگالی جنہوں نے مغربی پاکستانیوں سے تعاون کیا تھا۔ سب شکار ایک عمارت میں جمع ہیں اور محبوس ہیں.... ہوٹل غیر جانبدار علاقہ تھا۔ یہاں کسی کے پاس اسلحہ نہیں۔ اس کی حفاظت کے لیے کوئی گارد متعین نہیں۔ اب یہ عمارت صلائے عام دے رہی ہے اور لوگوں کی نظریں اس پر ہیں۔

ریڈ کراس کے اراکین بھی اِسی خوف سے لرزاں ہیں۔ ان کے تمام غیر ملکی رضاکار باہر گیٹ پر جا کھڑے ہُوئے ہیں۔ اور بعض ادھر گھوم کر ان چہروں کو تسلّی دینے کی کوشش کر رہے ہیں۔ جو زیادہ گھبرا رہے ہیں۔

ہوٹل میں مضطرب سی خاموشی ہے۔ بوجھل، بے چین اور تکلیف دہ خاموشی۔ ایسی خاموشی جو اِکّا دکّا باتوں کے باوجُود نہیں ٹوٹتی۔ بلکہ اور گہری ہو جاتی ہے۔ باتیں بھی دھیمی ہیں اور مختصر۔ جن میں کہنے والا کچھ کہہ جاتا ہے مگر سُننے والا نہیں سُنتا۔ وُہ اپنے گہرے خیالات میں ڈوبا ہے

اور جاننا ہے کہ کہنے والے نے بھی اپنے اصل خیالات سے بچنے کے لیے اوپری بات کی تھی۔ جہاں باتیں فرار کا ذریعہ بن جائیں۔ وہاں خاموشی گھمبیر ہو جاتی ہے۔ سنسان لاونج اس کو اور بھی بڑھا رہا ہے۔ کیونکہ زیادہ تر لوگ اپنے کمروں میں چلے گئے ہیں۔ صوفوں اور کرسیوں کی گود خالی پڑی ہے۔ فرش پر قدموں کی چاپ نہیں۔ ری سیپشن پر رونق نہیں۔ اِدھر اُدھر دو چار چہرے نظر آتے ہیں۔ مگر ان میں سے جو خاموش ہیں وہ صدیوں سے چُپ لگتے ہیں اور جو بولتے ہیں وہ ماحول میں مخل نہیں ہوتے۔

لفٹ کنوئیں کے ڈول کی طرح اوپر نیچے ہو رہے ہیں۔ دھیرے دھیرے اور چُپ چاپ...... ان کی خاموشی کو نہ اندر آنے والا توڑتا ہے اور نہ باہر نکلنے والا....... پانچ سات لوگ شوکیس میں سجی ہوئی گڑیوں کی طرح پاس پاس کھڑے ہیں۔ اور مختلف منزلوں پر رُکتے ہوئے اُوپر جا رہے ہیں یا نیچے آ رہے ہیں۔........ کبھی کبھار چھینک یا کھانسی لفٹ کی تنگ دیواروں سے ٹکرا کر نقارے کی صدا بن جاتی ہے۔ بیزار کُن اور اعصاب کُش صدا۔ جس کی گونج برداشت پر بھاری ہے۔ اور مدھم پڑتے ہی سناٹا سنسانے لگتا ہے۔

مگر یہ خاموشی بھی خاموشی نہیں ہے۔ کیونکہ ساکن لبوں کے پیچھے ذہن کے گنبد میں اندیشوں کی چیخیں گونج رہی ہیں۔ یہ اندیشے جو حقیقی بھی ہیں اور بھیانک بھی۔ مارچ اور اپریل کی یادوں سے سیاہ دھواں بن کر نکل رہے ہیں۔ اگر اس وقت بہاری اور مغربی پاکستانی اذیتیں دے دے کر ہلاک کئے جا سکتے تھے تو اب تو آزار کی حرص ویسے ہی جوان ہو چکی ہے۔ جس کا تر نوالہ یہ لوگ ہیں۔ جو دم سادھے، لب سیئے، دِل پکڑے موت کی پرچھائیں کو کھڑکیوں، دروازوں اور شیشوں میں سے جھانکتا دیکھ رہے ہیں۔ موٹر کی آواز، لوگوں کا شور، یا بندوق کا فائر ان کے کان کھڑے کر دیتے ہیں........ وقت تھم گیا ہے...... زندگی کی رفتار رُک گئی ہے...... خوف و ہراس کی یخ بستہ سلوں نے ہر شے منجمد کر دی ہے۔..... اور ڈھلتی سہ پہر کی سی آہستگی سے اجل کا سایہ دھیرے دھیرے بڑھتا آرہا ہے۔

مَیں ہمیشہ سمجھتا تھا کہ مَیں نے موت کو بارہا دیکھا ہے۔ بھاری پاؤں تلے حقیر سے کیڑے کو کچلا ہُوا دیکھا ہے۔ چھُری کی تیز حرکت سے مُرغ کی ننھی سی شہ رگ میں سے خون کو اُبل اُبل کر نکلتے دیکھا ہے۔ شکاری کی گولی سے فضا میں تڑپتا

اور پھڑ پھڑاتا پرندہ دیکھا ہے۔ عید پر قربان ہونے والے بکرے کی آخری غرغراہٹ سُنی ہے۔ جان کنی میں اکڑتے اور کھینچتے ہوئے انسانی جسم کو دیکھا ہے۔ جنازوں کو کاندھے دیئے ہیں۔ لاشوں کو لحد میں اتارا ہے۔ پسماندگان کو پچھاڑیں کھا کھا کر گرتے دیکھا ہے۔....... مگر جو کچھ آج دیکھ رہا ہوں۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ مَیں نے آج سے پہلے موت کو کبھی نہیں دیکھا۔ اور موت کا اصل رُوپ آج ہی دیکھ رہا ہوں۔

اب اگر میرے گرد قاش بہ قاش کٹے ہوئے انسانی جسم پڑے ہوں۔ اور ان میں سے خون ٹپک رہا ہو تو مَیں یہ کہوں گا کہ" یہ موت نہیں ہے۔ یہ تو محض ایک اندوہناک منظر ہے۔ موت کا اصل رُوپ اس کا کشتہ نہیں۔ بلکہ اس کی آگہی ہے۔ آہ کا المیہ ہے۔ شکار ہونے والے کی وحشت ہے۔ موت کا اصل رُوپ وُہ زندہ انسان ہے جو قضا کی پرچھائیں اپنی طرف بڑھتے دیکھتا ہے۔ بیمار یا ضعیف بوڑھا نہیں بلکہ تندرست و توانا انسان جو بے وقت اور غیر قدرتی موت سے دوچار ہے۔ موت کا اصل رُوپ نظر آتا ہے۔ پیلے چہروں میں، پھٹی پھٹی آنکھوں میں۔ لرزتے ہاتھوں میں۔ خشک ہونٹوں میں۔ اور

ناہموار سانسوں میں ۔ میرے اِرد گرد اتنے زیادہ چہروں پر
یہ رُوپ اتنا واضح اور صاف نظر آ رہا ہے کہ اس کا مجموعی
نظارہ کچلے ہوئے کیڑے، تڑپتے ہُوئے پرندے یا جانکنی میں
سسکتے ہُوئے انسان سے کہیں زیادہ ہیبت ناک ہے ۔

اِتنے بڑے گروہ میں ہر چہرہ اکیلا ہے ۔ اپنی ذات میں
دھنسا ہُوا ۔ بے یار و مدد گار ۔ دوسرے کی مدد کرنے سے قاصر
خود کو مدد ملنے سے مایوس ۔ ہر کوئی نفسا نفسی کے عالم میں
پل صراط پر اپنا توازن رکھ رہا ہے کہ نیچے نہ لڑھک جائے ۔

مختلف چہروں پر ایسے ایسے رنگ اُبھر رہے ہیں ۔
جو زندگی میں کبھی دیکھنے میں نہیں آئے ۔

بعض آنکھوں کی پتلیاں پھیل گئی ہیں ۔ بالکل سہمی ہُوئی
بلّی کی طرح ۔

بعض لوگ بات کرتے ہیں تو الفاظ اُلجھ جاتے ہیں ۔

ایک خاتون ایک پیکیٹ پر رسّی باندھنا چاہتی ہیں ۔ مگر
انگلیوں کی لرزش کی وجہ سے گرہ نہیں دے سکتیں ۔

ایک ماں اپنی بچّی کا بازو پکڑے ملبے کار یڈور میں دھیرے
دھیرے چلی جا رہی ہے ۔ وُہ چلنے میں ڈول رہی ہے ۔ اور اس

کے ہاتھ کی گرفت بہت مضبوط ہے۔ جیسے کوئی ڈوبنے والا تنکے کو پکڑے۔ ماں جو زندگی کو جنم دیتی ہے۔ اب زندگی سے مایوس ہو کر اُسی بچّی کے دُبلے پتلے لاغر بازو میں سہارا تلاش کر رہی ہے۔ جس کا کل تک وہ خود سب سے بڑا سہارا تھی۔

ایک پانچ سالہ بچّہ کمرے کا دروازہ تھوڑا کھول کر باہر جھانک رہا ہے۔ مَیں کھلے دروازے میں سے ایک بزرگ کو سجدے میں گرا دیکھ رہا ہوں۔ پھر گھڑی دیکھتا ہوں۔ ابھی نماز کا وقت نہیں ہوا۔ مگر جس طرح فریاد کی کوئی لے نہیں ہے۔ اسی طرح دُعا کا کوئی وقت نہیں ہے۔

لمبا کاریڈور سنسان پڑا ہے۔ کمروں کے دروازے بند ہیں۔ اور ان بند دروازوں کے پیچھے بارونق کمروں میں زندگی نہیں ہے محض زندگی کا سایہ ہے۔

زندگی کا رنگ اور رونق اگر کہیں نظر آتا ہے تو گیٹ پر کھڑے ہوئے غیر ملکی چہروں پر ہے۔ جو آپس میں مشورے کر رہے ہیں۔ مسکرا مسکرا کر مذاق کر رہے ہیں۔ اور سگریٹ کے ہر کش کا پیل پیل کر مزہ لے رہے ہیں۔

سارے ہوٹل کے دو تین چکّر لگانے کے بعد میں واپس

کمرے میں آگیا ہوں۔ اور اب اپنا بچا کھچا سامان باندھ رہا ہوں۔ کافی سامان پہلے ہی مختلف جگہ سے نقل مکانی کرتے ہوئے چھوڑ چکا ہوں۔ اور اب بھی اس طرح باندھ رہا ہوں۔ کہ ایک چھوٹے سے بیگ میں صرف ضرورت کی دو چار چیزیں۔ اور باقی سوٹ کیس میں۔ مجھے اندازہ نہیں کہ ہم سامان ساتھ لے جا سکیں گے یا نہیں۔ کیا معلوم صرف تن کے کپڑوں میں جانا پڑے۔ نہ معلوم وُہ کب ہمیں لینے آئیں گے۔ اور نہ معلوم وُہ کون ہوں گے۔ہندوستانی فوج والے۔مکتی باہنی والے۔ یا مسلح ہجوم؟ موسم گو اتنا ٹھنڈا نہیں مگر مَیں ذرا بھاری کپڑے پہن لیتا ہوں۔ نہ معلوم رات کس حالت میں اور کہاں کاٹنی پڑے۔ یہ سوالات باہم صلاح مشورے سے پیدا ہوئے ہیں۔

سامان باندھنے کے بعد مَیں پلنگ پر لیٹ کر انتظار کرنے لگتا ہوں کہ وُہ کب آتے ہیں۔ اور یہ بھی سوچتا ہوں کہ "وُہ" کون ہوں گے۔

دُور و نزدیک سے فضا میں اکّا دکّا فائرنگ کی آوازیں آنے لگتی ہیں۔.........

مجھے خیال آتا ہے کہ ان لمحوں کا بہترین استعمال یہ ہے

کہ گھر خط لکھ ڈالوں۔ یعنی اس قسم کا خط جو میرے بعد اُن کے لیے مفید ثابت ہو سکے۔ چنانچہ سامان کھول کر اپنے ذاتی کاغذ نکالتا ہوں۔ اور بیوی کو سیدھے سادھے خط میں اپنے بنک اکاؤنٹ۔ جی پی فنڈ۔ انشورنس اور اسی قسم کی دوسری تفصیلات لکھتا ہوں۔ پھر یہ بتاتے ہوئے کہ میرے مستقبل کا ابھی کوئی اندازہ نہیں کہ کیا ہو گا۔ اسے صبر کی تلقین کرتا ہوں۔ اور کھلے لفافے میں ڈال دیتا ہوں۔ ایسا ہی ایک خط والدہ محترمہ کو لکھتا ہوں۔

اس کے بعد تھوڑے وقفے کے بعد گراؤنڈ فلور پر ریڈ کراس کے دفتر کے دو تین چکر لگاتا ہوں۔ مگر وہاں کوئی نہیں۔ وُہ لوگ باہر گیٹ پر کھڑے ہیں۔ مَیں نکل کر باہر جانا چاہتا ہوں۔ تو ہوٹل کا ملازم مجھے دروازے پر روک دیتا ہے۔ کہ ریڈ کراس والوں کا حکم ہے کہ کوئی مغربی پاکستانی باہر کھلے صحن میں نظر نہ آئے۔ مَیں مایوس ہو کر کمرے میں جانے لگتا ہوں تو لفٹ میں ریڈ کراس والا مشفق چہرہ مِل جاتا ہے۔

مَیں اُسے خط دینا چاہتا ہوں۔ تو وُہ انکار کر دیتا ہے کہ ریڈ کراس والے صرف اپنے مجوزہ فارم پر پیغام بھجوا سکتے

ہیں۔ اور فارم ابھی آئے نہیں۔

میں اُسے سمجھاتا ہوں کہ بہ ریڈکراس کی معرفت نہیں بلکہ اس کو ذاتی طور پر دے رہا ہوں۔ کہ وُہ مہینہ دو مہینے بعد جب بھی مناسب سمجھے اس کو پوسٹ کر دے۔ مگر وُہ راضی نہیں ہوتا۔

میں اُسے سمجھاتا ہوں کہ اس میں کوئی ایسی قابلِ اعتراض چیز نہیں جو اس کی غیر جانبدارانہ پوزیشن خراب کرے۔ اور لفافہ اب بھی کھُلا ہے۔ وُہ خط دیکھ سکتا ہے۔

وُہ سوچ میں پڑ جاتا ہے۔

"اور یہ خط نہیں بلکہ چند ہدایات ہیں۔" اور میں اسے کھول کر دکھاتا ہوں۔

وُہ خط لے کر کوٹ کی اندرونی جیب میں ڈالتا ہے۔ میری طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتا ہے۔ پھر گرمجوشی سے ہاتھ ملاتا ہے۔

خطوط لکھنے کے بعد میں ذہنی طور پہ خاصا ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہوں۔ کھڑکی سے باہر جھانکتا ہوں تو اکاّ دُکاّ لوگ باہر نکل رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے ابھی خبر پُوری طرح نہیں پھیلی۔

ریڈیو کا بٹن دباتا ہوں۔ مگر ابھی ڈھاکہ ریڈیو شروع نہیں ہوا ہوائی حملے کے دوران نشریات بند کر دی جاتی ہیں۔ اور کل تو مسلسل ہوائی حملے ہوتے رہے ہیں۔ جس کے بعد سے زندگی کی چال بالکل بگڑ گئی۔

سامان بند ہے۔۔۔۔۔۔۔ ریڈیو خاموش ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔

کمرہ اداس ہے۔۔۔۔۔۔۔ باہر خطرے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔ دل میں اندیشے ہیں۔۔۔۔۔۔۔ ایسے میں کسی چیز پر توجہ نہیں لگتی۔ میں کمرے سے باہر آ جاتا ہوں۔ ساتھ والے کمرے میں کافی بھرے اکٹھے ہیں۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھ رہے ہیں۔ میں بھی شامل ہو جاتا ہوں۔

ڈھاکہ ریڈیو سٹیشن کی عمارت ہوٹل سے ملحق ہے۔ اس کے باہر کوئی دو سو لوگوں کا ہجوم ہے۔ ان میں سے بعض کے پاس سٹین گنیں ہیں۔ بعض کے پاس رائفلیں اور ڈنڈے ہیں اور باقی خالی ہاتھ ہیں۔ وہ ریڈیو سٹیشن کی عمارت کے گیٹ پر کھڑے ہیں۔ جے بنگلہ کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اور چند لوگ اندر کمپاؤنڈ میں گھوم رہے ہیں۔ اندر گھومنے والوں میں سے دو تین مسلح ہیں۔ اور ایک سفید کپڑوں میں ملبوس مکتی باہنی کا کارکن

ہے۔ وُہ بھی سٹین گن ہاتھ میں لیے ہے۔ عمارت کے پچھلے
لان میں خندقیں کھدی ہیں۔

عمارت پر مغربی پاکستان پولیس کے آٹھ دس لوگوں کی گارد ہے۔ ان کے پاس محض رائفلیں ہیں۔ صرف ایک کے پاس سٹین گن ہے۔ یہ گھبراہٹ میں اِدھر اُدھر دوڑ رہے ہیں۔ ان کا انچارج بندوق تانے آگے بڑھتا ہے۔ اور ان لوگوں کو جانے کو کہتا ہے۔ جو سیڑھی لگا کر چھت پر جانا چاہتے ہیں۔ ان میں سے ایک کے پاس بنگلہ دیش کا چھوٹا سا جھنڈا ہے۔ جسے وہ پاکستان کے جھنڈے کی جگہ لگانا چاہتے ہیں۔

پولیس کے لوگوں کو ابھی اطلاع نہیں ملی کہ پاکستان جنگ ہار چکا ہے۔ اور ہتھیار ڈال دیے گئے ہیں۔ اس لیے وُہ نہ تو کرفیو کی خلاف ورزی دیکھنا چاہتے ہیں اور نہ کسی کو پاکستان کا جھنڈا اتارنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ نگران کے سامنے کئی گنا زیادہ ہجوم ہے۔ جن کے پاس اسلحہ بھی بہتر اور زیادہ ہے۔ مقابلہ کرنے میں شکست ہے۔ بھاگ کر نہیں جا سکتے اور اگر روکتے نہیں تو منصبی غفلت ہے۔

جس بلندی سے ہم دیکھ رہے ہیں۔ وہاں سے ڈھاکہ ریڈیو

کی عمارت ایک ڈبّے کی طرح نظر آتی ہے۔ سپاہی اس کی بغلوں میں گھس رہے ہیں۔ اور اِدھر اُدھر بھاگ رہے ہیں۔ کوئی بچاؤ کی خاطر اور کوئی پوزیشن لینے کے لیے۔ ان کا انچارج ان لوگوں سے جھگڑ رہا ہے جو اُوپر چڑھنا چاہتے ہیں۔ اس لیے گارد والے بغیر لیڈر کے ہیں اور سراسیمہ ہیں۔

ہجُوم کے نعرے تیز سے تیز تر ہو رہے ہیں۔

پھر ایسا لگتا ہے۔ کہ انچارج نے فیصلہ کر لیا ہے۔ اور سٹین گن سیدھی کر کے ان لوگوں کو پکارتا ہے۔ باہر سے ہجوم نعرے لگاتا ہے۔ مگر کمتی باہنی والا ہاتھ کے اشارے سے اُسے روکتا ہے اور سٹین گن کندھے سے لٹکا کر آگے آتا ہے۔ پھر وُہ انچارج سے کچھ کہتا ہے۔ اور غالباً وہ سمجھ جاتا ہے۔

انچارج واپس جا کر اپنے سپاہیوں سے بات کرتا ہے۔ اور جس طرح خاموش فلموں میں کرداروں کے جذبات و احساسات واضح ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح ہم اتنی بلندی سے اُن کی بات چیت سُنے بغیر ان کی مایوسی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ وُہ تھکے تھکے قدموں سے پیچھے خندقوں کی طرف چلے جاتے ہیں۔ دو چار خندقوں کے اندر بیٹھ جاتے ہیں۔ ایک دو

صرف ٹانگیں اندر لٹکا کر زمین پر بیٹھ گئے ہیں۔ ایک اوندھے مُنہ گھاس پر لیٹ گیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مجھے یقین ہے کہ وُہ رو رہا ہے۔

اب ہجوم دیوانہ وار اندر گھس جاتا ہے۔ دو آدمی چھت پر چڑھ چکے ہیں۔ وُہ پاکستان کا جھنڈا کھینچ کر نیچے اُتارتے ہیں۔ اُسے پھاڑتے ہیں۔ اور اُس کے پُرزوں کو پاؤں تلے روندتے ہیں۔

اپنا پرچم اور اپنے ہی پاؤں۔۔۔۔۔۔۔۔۔
حیف اس چار گرہ کپڑے کی قسمت غالبؔ

پھر بنگلہ دیش کا جھنڈا پھڑ پھڑانے لگتا ہے۔۔۔۔۔
مَیں گھڑی دیکھتا ہوں۔۔۔۔۔۔ بارہ بج کر انتیس منٹ۔
ہمارے کمرے میں چند سسکیاں اُبھرتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔
ایک چہرہ تو بلک بلک کر رو دیتا ہے۔

اب کسی نے پاکستانی جھنڈے کے پُرزوں کو آگ لگا دی ہے۔۔۔۔۔۔۔۔ مَیں دِل ہی دِل میں اس مُٹھی بھر شعلے اور گز بھر دُھوئیں کو سلام کرتا ہوں۔۔۔۔۔۔۔پھر ہجوم اشک میں تارِ نگاہ نایاب تھا۔

باہر لوگ رائفلیں اور سٹین گنیں اُٹھا کر خوشی سے ہوا میں
فائر کرتے ہیں۔ یہ عجیب قسم کی خوشی ہے کہ

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اک سے ہاتھ ملاؤ کہ جشن کا دن ہے

خود کشی کا جشن........
سلومی کا رقص........
کلوپیٹرا کے غلام کی آخری رنگین رات.......
میر جعفر کا قہقہہ........
ققنس کا آخری گیت........
دیپک راگ....... اور پھر ہر طرف آگ......
ہجوم اب ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کا رُخ کرتا ہے۔......
پیم پلم [illegible] ہے کہ مجھے اب
کچھ دیکھنے کی خواہش نہیں۔ خواہ وُہ بازوئے قاتل ہی کیوں نہ
ہو۔ اور مَیں اپنے کمرے میں چلا جاتا ہوں۔
تھوڑی دیر بعد مجھے ایک اور چہرہ بتاتا ہے جو اپنے
کمرے کی کھڑکی سے دیکھ رہا تھا۔ کہ ہجوم نے اندر گھسنے کی
کوشش کی تھی۔ مگر گیٹ پر ریڈ کراس والے روکتے رہے۔ کافی

دیر بحث ہوتی رہی۔ اور بالآخر ریڈکراس والوں نے ٹیلی فون کے ذریعے مکتی باہنی کے ایک کمانڈر کو بلوا لیا۔ جس کے کہنے سے وہ لوگ منتشر ہو گئے۔

مگر اب چہروں کو خطرہ ہے کہ یہ تو ڈیڑھ دو سو لوگ تھے۔ منتشر ہو گئے۔ اگر کوئی بڑا ہجوم آ گیا تو کیسے روکیں گے۔

مجھے کیا بُرا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

اب مَیں پہلی دفعہ دیکھ رہا ہوں کہ بعض چہرے خلوص دل سے دُعائیں مانگ رہے ہیں۔ کہ ہندوستانی فوج جلدی آ جائے۔

اور جب ڈیڑھ بجے پہلی جیپ انڈین آرمی کے افسروں کو لیے ہوٹل میں داخل ہوتی ہے۔ تو کئی چہرے دمک اُٹھتے ہیں۔..........

اپنا ملک ـــــ اپنے لوگ۔ ـــــ مگر اماں ملی تو کہاں ملی۔ ـــــ دشمن کی سنگینوں تلے ـــــ اُس کی یلغار عفوِ بندہ نواز بن گئی۔ ـــــ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

جیپ کو لوگوں نے باہر ہی گھیر لیا ہے۔ وُہ ہندوستانی فوجیوں کے ساتھ ہاتھ ملا رہے ہیں۔ ان کے لیے زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ اور........ اور.....رُبِّ اکبر

والے دلکش حسین چہرے پیش پیش ہیں۔........ لڑکیاں اس گرمجوشی سے ہاتھ ملا رہی ہیں۔ کہ بغل گیر ہونے میں ذرا سی ہی کسر رہ جاتی ہے۔......... سانولی سلونی بوٹے سے قد کی لڑکی ایک افسر کا بازو پکڑ کر ہلاتی ہے۔ ہاتھ کو چُومتی ہے۔ اور پھر اس عقیدت سے جُھک کر اس پر ماتھا رکھتی ہے جیسے

جو تیرے در پہ خم ہو گئی   وُہ جبیں محترم ہو گئی

ہوٹل کا بنگالی سٹیورڈ جو کھانے کے کمرے میں بالکل گونگا بنا کام کر رہا ہوتا ہے۔ اس وقت کھل کر ہنس رہا ہے۔ اور پھر ایک مغربی پاکستانی چہرے کی طرف دیکھ کر طنز سے کہتا ہے۔

"دیکھا صاحب"

مَیں سوچتا ہوں ہم کون سی نئی چیز دیکھ رہے ہیں۔ اس برّ ِعظیم کی تاریخ میں یہ منظر بار بار دیکھنے میں آیا ہے........ جب بھی مرکز میں نا اہل اور بد دیانت لوگ آئے۔ تو دُور کے علاقوں میں غدّاروں نے کمریں کس لیں۔ کسی بیرونی طاقت سے سازش کی۔ اور سلطنت کی کمر میں چھُرا گھونپ دیا...... اب بھی گردشِ ایّام پیچھے کی طرف دَوڑی ہے ....بنگال نے آج بھی وہی کیا جو اکثر کیا ہے۔ اور یہ لڑکی بھی آج وہی کر

رہی ہے جو اس سے پہلے لڑکیاں کرتی رہی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ مگر

کاش اس کی بجائے کوئی اور لڑکی ہوتی۔

مگر کیا ہم اس بوسے کو ماضی بعید کی تاویلوں میں دفن کرکے

بات ختم کر سکتے ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ماضی قریب کیا کہتا ہے۔؟

۔۔۔۔۔۔۔۔ ماضی قریب کرب آمیز لہجے میں کہتا ہے۔ کہ

مارچ ۱۹۷۱ء کے بعد ہمیں آخری موقعہ ملا کہ اس ملک کی وحدت

کو قائم رکھ سکیں۔ مگر ہم نے اسے یوں استعمال کیا کہ

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آ سکتا نہیں

مگر خدا کی آنکھ ہماری آپ کی آنکھ سے مختلف ہے۔ لب

وُہ بھی نہیں ہلاتا۔ مگر اپنی بے آواز لاٹھی چلانا خُوب جانتا ہے۔

۔۔۔۔۔۔۔ اور جب یہ لاٹھی چلتی ہے۔ تو نہ کڑک، نہ گرج

۔۔۔۔۔۔۔ فقط جبینیں جھک جاتی ہیں۔۔۔۔۔۔۔ اگر ہم قطرے

میں دجلہ دیکھنے والا دیدۂ بینا رکھتے ہیں تو ایک دُختر کی جُھکی

ہُوئی جبین میں پُوری قوم کی ذلّت نظر آ جانی چاہیئے۔

تھوڑی دیر بعد لفٹ میں داخل ہوتا ہوں تو بہروں کا

وہی گروپ وہاں پہلے ہی موجود ہے۔ انڈین فوجی افسر کے

ہاتھ چُومنے پر پشیمانی کے آثار نہیں بلکہ چمکتی آنکھیں۔ پُرجوش سانس،

اور کِھلے ہُوئے چہرے ہیں۔ وُہ سب مجھے طنزیہ نظروں سے دیکھ کر مُسکراتے ہیں۔ شاید ایک آدھ لہر ہنسی کی بھی اُٹھتی ہے۔

"آپ بہت خوش ہیں آج ؟" مَیں اس سانولے سلونے دلکش چہرے سے پوچھتا ہوں۔

وُہ میری آنکھوں میں سیدھا دیکھتے ہُوئے کہتی ہے

"جے بنگلہ"

اتنے میں لفٹ رُکتی ہے۔ انہوں نے اس منزل پر اُترنا ہے۔ باہر نکلتے نکلتے وُہ سب میری طرف دیکھتے ہُوئے پکارتے ہیں۔ "جے بنگلہ"

ایک دو بچّے انگوٹھا بھی دکھا رہے ہیں۔.........

مگر باپ صرف مُسکرا رہا ہے۔

لفٹ کا دروازہ بند ہوتا ہے تو مجھے جیسے سکون مل جاتا ہے۔ اور مَیں گیارہویں منزل کا بٹن دبا دیتا ہوں۔

مگر یہ سکون عارضی ہے...... تھوڑی دیر پہلے تو اس لڑکی کے بوسے کو تواریخی عمل کہہ کر مَیں اپنے آپ کو دھوکا دینے میں کامیاب ہو جاتا ہوں۔ مگر جب شام کے قریب اُسے دیکھتا ہوں تو میرے اندر سبھی کچھ ڈھیر ہو کر ملبہ بن جاتا ہے۔

دُبّے اکبر والے دلکش چہرے کاریڈور میں آ رہے ہیں۔
ماں باپ بھی ساتھ ہیں۔ میری نظریں سانولے سلونے چہرے کو
ڈھونڈتی ہیں۔ اور......... اور.........

مَیں تڑپ اُٹھتا ہوں۔

اس نے ماتھے پہ بندی لگائی ہوئی ہے۔

یہ ایک دلکش چہرہ ہے...... چاند کی طرح......
مگر یہ بندی گہن بن کر اس کی دلکشی کو کھا گئی ہے۔ اور اب
یہ چہرہ ایک تہذیب کا کھنڈر بن کر مجھے ڈرا رہا ہے۔.....

اس قوم کی بیٹیوں کو یہ ترغیب دی جاتی تھی۔ کہ اپنے
ماتھے کے آنچل کو پرچم بنا لیں۔ مگر اس قوم نے اپنا پرچم جلا دیا۔
اور بیٹی کا ماتھا داغدار کر دیا...... تواریخ کی لہروں میں
سیاسی چولا بدلنا تو سمجھ میں آتا ہے۔ مگر اپنی روح کو بدل ڈالنا
میری سمجھ سے باہر ہے۔ مَیں جانتا ہوں کہ بنگال میں بندی کا
رواج ہے۔ مگر اس وقت اس چہرے کی بندی رواج والی
بندی نہیں۔ یہ تو ایک سیاسی تبدیلی کی نقیب بن کر اُبھری
ہے۔ یہ تو ایک تہذیب کے ہاتھ پر دوسری تہذیب کے
ماتھا ٹیکنے کا نشان ہے...... جب ہمارا جھنڈا جلا۔ تو

ملک کے ایک حِصّے نے ہتھیار ڈالے تھے۔ مگر جب مُسلمان ماتھے پر خوشامد سے بندی چمکی تو پُورا کلچر ہار مان گیا۔۔۔۔ کلچر کے اوراق تو صدیوں بعد اُلٹتے ہیں۔ اور یہاں تین گھنٹوں میں ہی کایا پلٹ گئی۔ ؎

کوئے جاناں میں کھُلا میرے لہُو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کِس کِس کو صدا میرے بعد

مجھے یوں لگتا ہے کہ ہم اب ہارے ہیں۔ اور احساسِ شکست میرے رگ وپے میں زہر بن کر گھُس جاتا ہے۔ مَیں بمشکل اپنے کمرے میں پہنچتا ہوں۔ اور اپنے آپ کو چارپائی پر گرا دیتا ہوں۔

(کافی دن بعد اخبار سے پتہ چلا کہ ان دلکش چہروں کا باپ بنگلہ دیش حکومت نے گرفتار کر لیا ہے۔۔۔۔۔ الزام پاکستان کے ساتھ تعاون کا تھا۔۔۔۔۔۔۔ ایک ہی گھرانے کی دو نسلوں کا یہ تضاد مشرقی پاکستان کا عام المیّہ ہے۔)

دریں اثنا اور بھی بہُت کچھُ ہوتا رہا ہے۔ ہم دوپہر کے وقت ریڈیو پاکستان سے خبریں سُنتے ہیں۔ وہاں ہتھیار ڈالنے

کا کوئی ذکر نہیں ۔ حالانکہ جو کچھ ہوا ہے ۔ صدر یحییٰ کی منظوری سے ہوا ہے ۔ سہ پہر کی خبروں میں بھی ذکر نہیں ۔ شام کو صدر کی تقریر اس ضمن میں خاموش ہے ۔ اسی طرح رات کی خبریں بھی ۔ بالآخر جب خبر آتی ہے تو یہ کہ مشرقی پاکستان میں دونوں کمانڈروں کے باہمی انتظام سے لڑائی بند ہو گئی ہے ۔ مغربی پاکستان میں تو معلوم نہیں لوگ اسے کیسے سمجھ رہے ہیں ۔ مگر ڈھاکہ میں ہر کوئی انگشت بدنداں ہے ۔

باہر لوگ سڑکوں میں گھومنے شروع ہو گئے ۔ وہ بنگلہ دیش کے جھنڈے اٹھائے ہیں ۔ اور نعرے لگاتے جا رہے ہیں ۔ شہر میں خبر پھیل رہی ہے کہ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں فوج آ گئی ہے ۔ اور مرد اور عورتیں کاروں اور رکشاؤں میں بیٹھ بیٹھ کر آ رہے ہیں ۔ اور آ کر فوجیوں سے ہاتھ ملاتے ہیں ۔ تھوڑی دیر بعد ہوٹل کے سامنے چھوٹا سا ہجوم جمع ہے ۔ اور جب انڈین فوجیوں کی پہلی بس آتی ہے جو اندر سے ٹھسا ٹھس بھری ہے تو یہ ہجوم دیوانہ وار ان کی طرف بڑھتا ہے ۔ ہاتھ ملاتا ہے ۔ نعرے لگاتا ہے ۔ گلے ملتا ہے ۔ سامنے والے مکان کے لان میں پھول اُگے ہیں ۔ لوگ بھاگ بھاگ کر ادھر جاتے ہیں ۔

ہیں۔ اور پھول توڑ کر فوجیوں کو پیش کرتے ہیں۔ اِدھر اُدھر سے اِکّا دُکّا فائرنگ کی آوازیں آتی ہیں۔ غالباً لوگ خوشی سے ہوائی فائر کر رہے ہیں۔

ایک کمرے کی کھڑکی سے ہم دیکھتے ہیں کہ افق پر ایک سیاہ دھبّہ آہستہ آہستہ بڑا ہو رہا ہے۔ غور سے دیکھنے پر پتہ چلتا ہے کہ بیس پچیس ہیلی کوپٹر اُڑتے آ رہے ہیں۔ غالباً انڈین کمانڈ کے افسران آ رہے ہیں۔ یہ آ کر ایئرپورٹ پر اُترتے ہیں۔ اور گرد کے بادل اُوپر اُٹھتے ہیں۔ کیونکہ مسلسل بمباری سے ایئرپورٹ سُرمہ بنی ہُوئی ہے۔

اڑھائی بجے کے قریب میری کھڑکی سے پاک آرمی کے جوان نظر آتے ہیں۔ جو ہوٹل کی طرف آ رہے ہیں۔ کیونکہ چھاؤنی کو راستہ ادھر سے جاتا ہے۔ وُہ ایک قطار میں فاصلے فاصلے پر چل رہے ہیں۔ بندوقیں کندھوں پر اور بستر سر پر۔ یہ وُہ لوگ ہیں جو ڈھاکہ کی جنگ کے لیے تیار ہو کر شہر میں پھیلے ہُوئے تھے۔ اور کل کی بمباری کا نشانہ بن رہے تھے۔ یہ تھکے ماندے، نڈھال اور افسردہ ہیں۔...... ہوٹل کے قریب آتے ہیں۔ تو ہجوم میں سے کوئی ان پر فائر کر دیتا ہے۔ یہ فوراً

سڑک کے کنارے مکانوں، درختوں اور نالوں میں پوزیشن لے کر ڈٹ جاتے ہیں۔ اور فائر کھول دیتے ہیں۔ ہجوم میں بھگدڑ مچ جاتی ہے۔ ادھر سے ہندوستانی فوجی بھی پوزیشن لے کر فائر شروع کر دیتے ہیں۔ جس گھر سے ابھی پھول توڑے جا رہے تھے۔ وہاں گولیاں سنسنا رہی ہیں۔ کیونکہ کئی ہندوستانی فوجی اس میں پوزیشن لیے ہوئے ہیں۔ رائفل اور مشین گن کا فائر زوروں پر ہے۔ اور سارا ہوٹل گونج رہا ہے۔

فائرنگ گھنٹہ بھر جاری رہتی ہے۔ اور دونوں طرف کچھ لوگ مارے جاتے ہیں۔

میری کھڑکی سے ریس کورس نظر آتا ہے۔ وہاں لوگ اکٹھے ہو رہے ہیں۔ نعرے لگ رہے ہیں۔ اور ہوائی فائر ہو رہے ہیں۔۔۔۔۔۔ پتہ چلتا ہے کہ ساڑھے چار بجے یہاں پاکستانی ایسٹرن کمانڈ کے جنرل نیازی عوام کے سامنے ہندوستانی جرنیل جگجیت سنگھ اروڑا کو باضابطہ ہتھیار ڈالیں گے۔۔۔۔۔ یہ وہی جگہ ہے جہاں مجیب نے سات مارچ کو تقریر کی تھی۔ اور جہاں جنوری میں سارے عوامی لیگی ممبران اسمبلی نے چھ نکات پر حلف اٹھایا تھا۔ شام کو اخبار نویسوں سے پتہ چلتا ہے

کہ جنرل نیازی نے ہندوستانی جرنیل کو اپنا پستول نکال کر پیش کیا تھا۔ اور عوام کی تعداد اتنی زیادہ نہ تھی جتنی توقع کر رہے تھے۔

ہوٹل کی کھڑکیوں سے جتنی سڑکیں نظر آتی ہیں اُن پر اب کہیں کہیں لوگ نظر آ رہے ہیں۔ زیادہ تر ٹرکوں میں نعرے لگاتے ہوئے۔ یا اکّا دُکّا کاروں میں۔ کبھی کبھار رکشا یا سائیکل پر اور خال خال پیدل۔ فضا میں نعرے بھی گونج رہے ہیں۔ شور بھی ہو رہا ہے۔ مگر جس جوش اور ولولے کی توقع تھی۔ اس سے بہت کم ہے۔ دیکھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ عوام کے ردِّ عمل میں نہ تو وہ بے ساختگی ہے۔ نہ گرمجوشی۔ جو ایسی قوم کی طرف سے ہونا چاہیئے۔ جنھوں نے لڑ کر اپنی بات منوائی ہو۔ پہلے دن ہمارا خیال تھا کہ لوگ محتاط ہیں۔ اور ڈھاکہ سے گئے ہوئے ہیں۔ مگر دُوسرے اور تیسرے دِن بھی یہی حال تھا۔ (کوئی ہفتہ بھر بعد جب بنگلہ دیش کے وزیر اعظم تاج الدین اور قائم مقام صدر نذر الاسلام ائرپورٹ پہ پہنچے۔ تو خیر مقدم کرنے والے لوگ بہت کم تھے۔)

ہم سارا دن انتظار کرتے رہتے ہیں۔ کرشانہ ابھی

ہمیں لینے آ جائیں۔ انڈین فوج کی وجہ سے ہجوم کا خطرہ تو ٹل چکا ہے۔ مگر بنگلہ دیش گورنمنٹ یا انڈین فوج کی طرف سے کسی وقت بھی گرفتاری ہو سکتی ہے۔ یا ویسے ہی پوچھ گچھ کے لیے بلاوہ آ سکتا ہے۔ یا کسی کیمپ میں لے جائے جا سکتے ہیں......
مگر شام تک کچھ نہیں ہوتا۔ مَیں دو تین دفعہ جا کر ریڈ کراس کے دفتر سے بھی پتہ کر آتا ہوں۔ مگر ان کو کوئی کچھ علم نہیں ہوتا۔ رات کے وقت البتہ اتنا پتہ چلتا ہے۔ کہ ایک دو دن تک ہمیں یہاں سے لے جائیں گے۔ نہ معلوم کہاں۔

رات کے وقت کھانے کے کمرے کا ماحول بالکل بدلا ہُوا ہے۔ یہ کسی قمار خانے کا ماحول لگتا ہے۔ جس میں ابھی ابھی جوُا ختم ہوُا ہے۔ ہارے ہوُئے لوگ سر جھکا کر احساس زیاں میں گُم ہیں۔ اور جیتنے والے خوشی سے پاگل ہو رہے ہیں۔ یہ ہار بھی معمولی ہار نہیں۔ کیونکہ ہارنے والے روایتی شہزادے کی طرح اپنی بیوی داؤ پہ لگا کر ہار گئے ہیں۔ کمرے میں جو کچھ ہو رہا ہے وہ اسے چور آنکھوں اور نیچی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ بالکل دھتکارے ہوُئے اجنبی کی طرح۔ جو کمرے کی ہر چیز سے بیگانہ ہے۔ اتنی گہری بیگانگی۔ جیسے اپنی

ذات سے بھی تعلق ختم ہو گیا ہے۔ نیم خوابی کی سی کیفیت جیسے کسی طلسم کی گرفت میں ہوں۔ چہروں پر ڈھکی چھپی تمنّا کہ

کرے ٹک منفعل کوئی میرے بیدرد قاتل کو
اور دِل میں دھواں کر سے
رَسائی آہ کی تا دامن افلاک دکھلاؤں

جیتنے والے یہاں کئی رنگوں میں موجود ہیں۔ غیر ملکی چہرے، جو خوشی سے دیوانے ہو رہے ہیں، دو تین میزیں جوڑ کر سب اکٹھے بیٹھے ہیں۔ بوتلوں کے کارک کھٹا کھٹ اڑا رہے ہیں۔ ایک دوسرے پر قہقہے نچھاور کر رہے ہیں۔ ہندوستانی فوجی افسروں کے گلے میں باہیں ڈال ڈال کر شراب پیش کر رہے ہیں۔ اور اپنے انگریزی زدہ لہجے میں پکار اُٹھتے ہیں۔ "جے بنگلہ"...... جب وُہ یہ نعرہ لگاتے ہیں تو ہال کو گویا سانپ سُونگھ جاتا ہے۔...... دُوسرے بنگالی اسٹیورڈ اور سٹاف۔ جن کے چہروں پر بشاشت ہے۔ مگر مکمل نظم وضبط سے اپنا کام کر رہے ہیں۔ وُہ غیر بنگالیوں کے ساتھ پہلے ہی کی طرح مؤدب ہیں۔ مگر بھاگ بھاگ کر غیر ملکی چہروں کی تواضع کر رہے ہیں۔ اور ہندوستانی افسروں کے سامنے بچھ بچھ جاتے ہیں۔

رات سوا آٹھ بجے صدر یحییٰ کی تقریر ہے۔ ہم بے صبری سے سُن رہے ہیں۔ تقریر میں تین باتیں غور طلب ہیں۔

اوّل تو مشرقی پاکستان میں ہتھیار ڈالنے کا ذکر نہیں ہے۔

دوسرے بیس دسمبر کو آئین کے اعلان کا ذکر ہے۔

تیسرے جنگ جاری رکھنے کا عزم ہے۔

معلوم نہیں مغربی پاکستان میں اس کا ردّ عمل کیا ہے۔ مگر ہمیں تو یہ باتیں بالکل غیر حقیقی لگتی ہیں۔ تقریر سُنتے ہوئے لوگوں کے مُنہ سے جو جُملے بے اختیار اُبل پڑے ہیں۔ وُہ بھی کچھ اچھے جذبات کا اظہار نہیں کرتے۔

بعد میں تبصرے شروع ہو جاتے ہیں۔ اور ابھی جاری ہیں۔ کہ ہندوستان کی طرف سے اگلے دن شام کو یک طرفہ جنگ بندی کا اعلان ہونا ہے۔ اب تبصرے قیاس آرائیوں میں بدل جاتے ہیں۔ کہ کل کیا ہو گا۔

صدر کی طرف سے جنگ جاری رکھنے کے عزم کے باوجود اگلے دن جنگ بندی ہو جاتی ہے۔ جب جمہُوریت نہ ہو تو لوگ ہر چیز کو "رموز مملکت خویش خسرواں دانند" کہہ کر خاموشی سے منظور کر لیتے ہیں۔ گو دِلوں میں یہ تاثر بھی گھوم رہا ہے کہ

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے۔

سترہ تاریخ کی صبح کو گولیوں کے شور سے آنکھ کھلتی ہے۔ ہر چند منٹ کے وقفے کے بعد کبھی مشین گن کا فائر ہو رہا ہے۔ اور کبھی رائفل کا۔ ویسے تو رات کو بھی اکا دکا گولیوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر اس وقت کی آوازوں میں تواتر اور تیزی ہے۔ یہ یقیناً جھگڑے کی نشاندہی کرتا ہے۔ ساڑھے آٹھ بجے کے قریب ناشتہ کرنے جاتے ہیں تو پتہ چلتا ہے۔ کہ میرپور اور محمد پور کے علاقہ میں (جو غیر بنگالیوں کی بستیاں ہیں) بڑے پیمانے پر قتل و غارت شروع ہے۔ تھوڑی دیر بعد ریڈکراس والے مشفق چہرے سے ملاقات ہوتی ہے تو وہ بتاتا ہے کہ ہم ساری رات لوگوں کو بچانے میں مصروف رہے ہیں۔ اور پھر سر پکڑ لیتا ہے۔

"او خدا! کتنا ظلم!!!!"

سارا دن ادھر اُدھر سے خبریں آتی رہتی ہیں کہ غیر بنگالیوں کو قتل کیا جا رہا ہے۔

شہر یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت
شیر دل بانکوں میں اپنے تیر نشتر کے ہدف!!!!!!

شام کو دو غیر ملکی اخبار نویس دانت پکچپا کر اس بربریت کا ذکر کرتے ہیں۔ جیسے وہ ابھی دیکھ کر آئے ہیں۔ شہید مینار پر مکتی باہنی کا بریگیڈیر عبد القادر صدیقی ایک ریلی سے سیلوٹ لیتا ہے۔ اس کے بعد تین اشخاص سٹیج پر لائے جاتے ہیں۔ سب سے پہلے بریگیڈیر صدیقی ان کو گھونسے مارتا ہے۔ پھر چند اور لوگ سٹیج پر آ کر اُن کو مارنا شروع کر دیتے ہیں۔ مارتے مارتے ادھ موا کر دیتے ہیں۔ پھر اُن کے پیٹ اور ٹانگوں میں سنگینیں کھبوئی جاتی ہیں۔ یہ سب کچھ سٹیج پر ہو رہا ہے اور سامنے پبلک خوشی سے "جے بنگلہ" کے نعرے لگا رہا ہے۔ جو چیز مارچ اپریل میں گھروں اور گلیوں میں ہوئی۔ وہ اب سٹیج پر ہو رہی ہے۔ واقعی آزادی بڑی چیز ہے۔ اگلے دن یہ خبر بی بی سی سے بھی براڈ کاسٹ ہوتی ہے۔

بیداد گروں کی بستی ہے، یاں داد کہاں خیرات کہاں
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں، فریاد جو گھر گھر جاتی ہے۔

غیر جانبدار علاقے میں سے ٹیلیفون تو کسی کو کر نہیں سکتے۔ مگر آج انہوں نے اکّا دکّا ملنے والوں کو اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ خبریں آنے لگتی ہیں۔ کہ گلشن کالونی لوٹ گئی۔ نیو مارکیٹ

لوٹ گئی۔ ہر جگہ لُوٹ مار جاری ہے۔ ایک ایرانی چہرہ جو ایک
بنگالن سے شادی شدہ ہے کھانے کے کمرے میں سب کو بتا
رہا ہے۔ کہ اس کا سارا گھر لٹ گیا ہے۔ اور اب وہ تیس
برس بعد یہ جگہ چھوڑ کر واپس ایران چلا جائے گا۔.....
سفید ساڑھی والا چلبلا چہرہ بھی پہلی دفعہ بغیر عینک کے نظر
آتا ہے۔ کیونکہ وُہ خاتون رو رہی ہے۔ آج اپنے گھر کا پتہ
لینے گئی تھیں۔ جب وہاں پہنچیں تو لوگ اُن کا گھر لوُٹ
رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر ان کا بٹوہ چھین لیا۔ کہ اس میں
ضرور ریوالور چھپایا ہو گا۔ اور ان کی نظروں کے سامنے بٹوے
میں سے تین ہزار روپیہ نکال کر جیبوں میں اڑس لیا۔ انہوں نے
احتجاج کیا تو بندوقیں سیدھی کر لیں اور بمشکل جان بچا کر آ بیٹھیں،
مَیں ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی سے نیچے جھانکتا ہوں۔ دس
پندرہ سال کے لڑکے کندھوں سے سٹین گن لٹکائے مست
ہاتھیوں کی طرح سڑک پر گھوم رہے ہیں۔ ہوٹل میں رہنے والوں
کی کئی کاریں باہر کھڑی ہیں۔ دو تین لڑکے گھوم پھر کر دیکھ رہے
ہیں۔ بالآخر ایک نئی کار کا انتخاب کرتے ہیں۔ جس کا کھلتا ہوا
نیلا رنگ ہے۔ بندوق کی نالی سے اس کی کھڑکی کا شیشہ

توڑتے ہیں۔ دروازہ کھول کر اندر سے سارا جائزہ لیتے ہیں۔ پھر بونیٹ کھول کر ایک لڑکا تاریں ملاتا ہے۔ اور کار سٹارٹ ہو جاتی ہے۔ وہ تینوں ہاتھ اُٹھا کر نعرہ لگاتے ہیں "جے بنگلہ" اور کار فراٹے بھرتی چل پڑتی ہے۔ ہندوستانی فوجی تھوڑی دُور کھڑے ہیں۔ مگر کوئی تعرض نہیں کرتے۔ بہت ممکن ہے کار کا مالک بھی ہوٹل کی کسی کھڑکی سے جھانک رہا ہو۔ اور اپنی جان کے خوف سے خاموش ہو رہا ہو۔

شام کو ہوٹل میں خبریں اُڑنے لگتی ہیں کہ آج رات مکتی باہنی کا مسلح حملہ ہوٹل پر ہو گا۔ پھرے بار بار ریڈ کراس والوں سے پوچھتے ہیں مگر وہ تسلّی دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ہندوستانی فوج کے سپاہی کافی تعداد میں آ جاتے ہیں۔ اور ہوٹل کے گرد چھا جاتے ہیں۔ چند لمحوں بعد مختلف اطراف سے چار ٹینک ہوٹل کی طرف لڑھکتے آتے ہیں۔ اور مناسب جگہوں پر کھڑے ہو کر توپوں کا رُخ باہر کی طرف موڑ لیتے ہیں۔

ہتھیار ڈالے جانے کے بعد آج دُوسری رات ہے۔ مگر زندگی کے معمول پر آنے کی پہلی رات ہے۔ کل رات بجلیاں نہیں جلی تھیں۔ نہ معلوم کیوں۔ شاید لوگ تواریخ کی عظیم قتلا بازی کی

لڑکھڑاہٹ سے سنبھل نہیں پائے تھے۔ یا شاید انہیں شک تھا کہ بنگال کی سرزمین پر مملکتِ پاکستان کی آخری ہچکی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ یا شاید پاور ہاؤس میں خرابی تھی۔ بہرحال جو بھی تھا۔ کل رات ڈھاکہ تاریک تھا اور ریس کورس کے اِرد گرد شراروں کا ناچ بھی نہ تھا۔

مگر آج شہر کی ہر بجلی چیخ چیخ کر روشنی لٹا رہی ہے اس کی شعاعوں میں شوخیاں ہیں۔ اِس کی چمک میں نخرے اور غمزے ہیں۔ ——— اس کی ہر کرن ہمارا مُنہ چڑا رہی ہے۔ مضحکہ اڑا رہی ہے اور تازیانے سونت رہی ہے۔ ——— دو ہفتے کی گھٹا ٹوپ تاریکی کے بعد پاور ہاؤس سے بجلی کی لہر تھرکتی ہوئی نِکلی ہے۔ مگر اس کی روشنی در و دیوار تو منوّر کر رہی ہے۔ لیکن ہمارے دلوں کی تاریکی دور نہیں کر سکی۔ وہ ظلمت تو ہر لحظہ بڑھتی ہی جاتی ہے ——— جتنی باہر چمک ہے۔ اتنا ہی اندر کا اندھیرا سیاہ ہے۔ لوگوں کی آنکھیں قمقموں کے اجالے سے چندھیا رہی ہیں۔ اور ہماری آنکھیں اس اجالے کے داغوں میں پھنس کر رہ گئی ہیں۔ ایک تکلیف دہ احساس ہمیں مسلسل کچل رہا ہے۔ کہ یہ روشنی اب ہماری نہیں رہی۔ ہم اب اس کے پروانے نہیں بن

سکتے۔ یہ الگ چمکے گی۔ ہم الگ تڑپیں گے۔ سوز کے رشتے ختم ہُوئے۔ وفا کے پیمان ٹوٹ گئے۔ اس کی محفل سُونی ہُوئی۔ ہماری دھڑکن سرد ہُوئی۔

شہر سے سارا دن گولیوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں۔ سترہ کو بھی اور اٹھارہ کو بھی۔

اٹھارہ کی صُبح کو ہمیں بتایا جاتا ہے۔ کہ سرکاری ملازمین جنگی قیدی ہیں۔ اور آپ لوگوں کو آج شام چار بجے ڈھاکہ چھاؤنی لے جائیں گے۔ جہاں جنگی قیدیوں کا کیمپ قائم کیا گیا ہے۔ فی الحال آپ سامان اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں۔ چار بجے ہم سب لاونج میں سامان سمیت جمع ہو جاتے ہیں۔ کل پچیس لوگ ہیں۔ مگر ہمارا اکٹھا ہونا سارے چہروں میں گھبراہٹ کی ایک لہر دوڑا دیتا ہے۔

"آپ کہاں جا رہے ہیں"؟

"کیوں جا رہے ہیں؟"

"ہمارا کیا بنے گا؟"

"ہوٹل تو کل سے غیر جانبدار علاقہ نہیں رہے گا۔ اس کے بعد ہمارا کیا بنے گا۔؟"

"ہم آپ کے ساتھ نہیں جا سکتے کیا ؟"

سراسیمہ چہرے کانپتے ہونٹوں سے ہمیں گھیر لیتے ہیں۔ اور تابڑ توڑ حملے کرتے ہیں۔ ہم انہیں کیا بتائیں۔ ہم تو خود قیدی ہیں۔ جدھر لے جائیں گے۔ چلے جائیں گے۔ میں ایک خاتون کا دل رکھنے کو کہتا ہوں۔ کہ آپ تو قیدی نہیں ہیں۔ اس لحاظ سے ہم سے بہتر ہیں۔

وہ ایک دم دُعا کے انداز میں ہاتھ اُوپر اُٹھا کر کہتی ہے۔ "یا اللہ یہ ہمیں بھی قیدی بنا لیں۔ کم از کم مکتی باہنی کے ہاتھوں دردناک عذاب سے تو بچ جائیں گے۔ انڈین آرمی مارے گی تو ایک آدھ گولی سے مگر یہ تو ہلاک کر کے مارتے ہیں۔"

میں اُسے مشورہ دیتا ہوں کہ وہ ریڈ کراس والوں سے بات کرے۔ اور پھر کتنے ہی لوگوں کو یہ مشورہ دینا پڑتا ہے۔ جو یکے بعد دیگرے اس قسم کے وسوسے لے کر میرے پاس آتے ہیں۔

چار بجے ہم نیچے آئے تھے۔ ساڑھے چار ہوئے۔ اور پھر ساڑھے پانچ ہو گئے۔ بالآخر چھ بجے پتہ چلتا ہے کہ راستے میں مکتی باہنی کے حملے کا خطرہ تھا۔ اس لیے آج نہیں جا رہے۔

ریڈ کراس والا مشفق چہرہ ہم لوگوں سے کہتا ہے کہ آپ

لوگ فوری اطلاع پر ہر وقت چلنے کو تیار رہیں۔ مجھے جب بھی پروگرام ملے گا۔ مَیں صرف اپنے تک محدود رکھوں گا۔ اور کسی کو نہیں بتاؤں گا۔ آپ لوگوں کو بھی صرف چند منٹ پہلے بتاؤں گا۔ اس لیے آپ کم از کم نوٹس پر چلنے کو تیار رہیں۔

"مگر کب تک ؟"

"یہ آج رات بھی ہو سکتا ہے۔ کل دن میں بھی۔ اور کل رات کو بھی..... کسی وقت ..... کسی بھی وقت" وُہ اُنگلی اُٹھا کر کہتا ہے۔

ہم لوگ رات کا کھانا کھا کر مشورہ کرتے ہیں کہ سامان بند رہنا چاہیئے۔ اور رات شب خوابی کے لباس کی بجائے اسی طرح پتلون میں سونا چاہیئے۔ ڈیوٹیاں لگتی ہیں کہ کون کس کو اطلاع دے گا۔ بغیر شور کے خبر کرے گا۔ اور اتنا محتاط ہو گا کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو گی۔ تا کہ بات مکتی باہنی تک نہ جا سکے۔

مَیں اپنے پلنگ پر کپڑوں سمیت اس طرح لیٹ جاتا ہوں جیسے ریلوے کے ویٹنگ روم میں کوئی رات کی گاڑی کے انتظار میں آرام کرسی پر اُونگھ جاتا ہے۔

دروازے پر دستک ....

مَیں ٹارچ جلا کر گھڑی دیکھتا ہوں ..... ساڑھے دس بجے رات۔

باہر ہمارا ایک ساتھی کھڑا ہے۔ سرگوشی میں بتاتا ہے۔ کہ صبح چار بجے روانگی ہے۔

رازدارانہ انداز میں بھاگ دوڑ شروع ہوتی ہے۔ سب کو پروگرام کی اطلاع ہو جاتی ہے۔...... کسی کے پاس الارم والی گھڑی ملتی ہے۔ اُسے کسی ایسے کے پاس رکھّا جاتا ہے جو بہت ہلکا سوتا ہے۔ اس نے تین اشخاص کو اطلاع دینی ہے۔ اور ان تینوں نے آگے باقی سب کو۔

مَیں کپڑے بدل کر لیٹ جاتا ہوں۔

صبح تین بجے اٹھایا جاتا ہوں۔ کل شام انہوں نے بتا دیا تھا کہ جہاں ہم لے جائے جا رہے ہیں۔ وہاں بجلی اور پانی نہ ہوں گے۔ اس لیے رات ساڑھے تین بجے غسل کرتا ہوں۔ نہ معلوم کتنے دنوں تک غسل نہ کرنا پڑے۔ اس لیے احتیاطاً [illegible] شیو بھی کر لیتا ہوں۔ اور پھر سامان اُٹھا کر چوروں کی طرح کمرے سے باہر آتا ہوں۔

مگر یہ کیا؟...... سارا کوریڈور سوٹ کیسوں سے بھرا پڑا ہے۔ تب پتہ چلتا ہے کہ صرف ہم لوگ ہی نہیں جا رہے بلکہ سبھی جا رہے ہیں۔ لفٹ چلا ہے کی کھڑی

میں بھاگنے والی شٹل کی طرح اوپر نیچے چکّر لگاتی رہتی ہے۔ اور نیچے لاونج آہستہ آہستہ مردوں، عورتوں، بچّوں اور سامان سے ایسے بھرنے لگتا ہے جیسے آٹے کی مشین پر بوری لبا لب بھر جاتی ہے۔

اس ہجوم میں پہلی قسم کے علاوہ باقی سب اقسام کے چہرے شامل ہیں۔ اور کوئی کسی کے مقدر پر رشک نہیں کر سکتا۔ ہمہ یاراں بہشت یا دوزخ۔ جو بھی ہو گا۔ کل نفری قریباً اڑھائی سو نفوس ہے۔ یہ آخری دفعہ ہے کہ مَیں وُہ سب چہرے اکٹھے دیکھ رہا ہوں۔ جنہوں نے غم کی شام میں مل کر ہمارے پرچم کے چاند تارے کا غروب دیکھا ہے۔ اتنے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے کے باوجُود ان کی دھڑکنیں ایک سی ہیں۔ دَرد کا دیدۂ تر اتنا مشترک ہے کہ ایک کے آنسو دُوسرے کی نگاہوں پر بہے ہیں۔ یہ رسوائی کے ساتھی ہیں۔ سیاہ بختی کے شریک ہیں۔ حشر کے رفیق ہیں۔ ہم نے تلخیٔ مئے ایّام اکٹھے چکھی۔ گردشِ دوراں کے ہچکولے اکٹھے کھائے۔ موت کے سائے تلے اکٹھے بیٹھے۔ ہماری اُمیدیں ایک۔ حسرتیں ایک اور آہیں ایک۔ ہمارا کارواں ایک، زبان ایک اور احساسِ زیاں

ایک۔ ہم سب اپنی اپنی گرہ میں اپنے اپنے گریبانوں کے تار لیے جا رہے ہیں۔ اور ایک ہی جنون کے کشتہ ہیں۔

مَیں دِل ہی دِل میں سب چہروں کو الوداع کہتا ہوں کیونکہ اس کے بعد ہماری منزلیں مختلف ہوں گی۔ اور ہم سے دشمن کا سلوک مختلف ہو گا۔ اپنے اپنے تجربوں کی نوعیت بدل جائے گی۔ اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اگر کوئی مشترکہ چیز ہو گی۔ تو یہ کہ :-

گو واں نہیں پہ واں سے نکالے ہُوئے تو ہیں
کعبے سے ان بتوں کو بھی نسبت ہے دُور کی

مُنہ کے آگے میگافون رکھ کر ریڈکراس کا ایک کارکن اعلان کرنے لگ جاتا ہے۔

سب سے پہلے گورنر اور ان کے وزرا مع اہل وعیال باہر جاتے ہیں۔ پھر ہم لوگوں کی باری آتی ہے۔ میرا نام پکارا جاتا ہے۔ تو مَیں دونوں ہاتھوں میں سوٹ کیس، بریف کیس اور چرمی بیگ لٹکائے باہر نکلتا ہوں۔ اور بوجھ سے لڑکھڑاتے ہوئے ایک کارکن کی انگلی کی سمت میں چل پڑتا ہوں۔ آگے ٹرکوں کی قطار لگی ہے۔ ایک ٹرک میں سامان پھینک کر میں

خود بھی چھلانگ لگا کر اس میں سوار ہو جاتا ہوں۔ اور سب لوگوں کے سوار ہونے کا انتظار شروع ہو جاتا ہے۔

مَیں اِدھر اُدھر نظر دوڑاتا ہوں۔ ڈھاکہ نکھری ہوئی رات میں خاموش ہے۔ فضا میں ویران خنکی ہے۔ سڑکوں کی بجلیاں منجمد آہ بن کر معلق ہیں۔ .... پتے سرسراتے ہیں تو جیسے حسرتیں سسکیاں لے رہی ہیں .... اجنبیت اور بیگانگی سرِراہ بکھری پڑی ہے .... مَیں اس رات کا موازنہ ۱۹۴۷ء کی اس رات سے کرتا ہوں۔ جب پاکستان بنا تھا۔ تیرہ اور چودہ اگست کی درمیانی شب جیسے کل کی بات ہو۔ .... تازہ اور شگفتہ رات میں سورہ فتح کی تلاوت اور مولانا ظفر علی خاں کی نعت "توحید کے ترانے کی تانیں اڑائے جا" کی گونج ریڈیو پاکستان لاہور سے اُبھری تھی۔ اور پھر لاہور کی چھتوں سے لوگوں نے دلولہ انگیز نعرے لگائے تھے۔ کہ "پاکستان کا مطلب کیا ہے۔ لا الہ الا اللہ"...... اِن دنوں ڈھاکہ میں بھی یہی نعرے گونجے تھے۔ مگر آج ہم اس کوچے سے بارشِ سنگ کے ساتھ نکالے جا رہے ہیں۔ تو یہ "سیکولر سوشلسٹ سٹیٹ آف بنگلہ دیش" ہے۔ اور یہاں کے جلسوں میں صرف "جے بنگلہ" کا نعرہ گونجتا

ہے۔ نعرۂ تکبیر نہیں گونجتا۔ مملکتِ خداداد پاکستان بنا کر خدا کو دھوکا دیتے ہیں تو ہم بنی اسرائیل کو بھی مات کر گئے۔ اور ایک ایسے معاشرے کو جنم دیا جس میں ایک دیانتدار آدمی کے لیے ذہنی اذیت اور ذاتی تکلیف کے علاوہ کچھ نہیں..... کچھ بھی نہیں۔ آج کی رات اُس وعدہ خلافی کی سزا ہے۔ جو ہم نے ۱۹۴۷ء والی رات کا وعدہ پُورا نہ کرکے کی ہے۔

جس ٹرک میں مَیں ہوں۔ اس میں بیس کے قریب لوگ بھیڑ بکریوں کی طرح لدے ہیں۔ ہمارے پاؤں میں سامان کے ڈھیر ہیں۔ ٹرک ہندوستانی فوج کے ہیں۔ اور ہم اندھیرے میں ٹٹول ٹٹول کر کوئی ایسی چیز تلاش کرتے ہیں جسے پکڑ کر چلتی گاڑی میں سہارا لے سکیں۔

ساڑھے پانچ بجے یہ حرماں نصیب قافلہ چل پڑتا ہے۔ اور دِل کی گہرائیوں سے فیض کا مصرع تیر بن کر نکلتا ہے۔ ع

میرے وطن تیرے دامنِ تار تار کی خیر